مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ
الامداد
لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۰ | ربیع الاول ۱۴۴۱ھ | نومبر ۲۰۱۹ء | شمارہ ۱۱

الاسعاد و الابعاد
آخرت کے لیے مفید و مضر کاموں کا استحضار

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے | زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور
35422213
35433049

پتہ دفتر: جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۱۳/۲۰ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

وعظ

الاسعاد و الابعاد

(آخرت کے لیے مفید و مضر کاموں کا استحضار)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت حکیم الامت نے یہ وعظ ۱۴ شعبان ۱۳۴۲ھ کو مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ۳ گھنٹہ بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۷۰ تھی مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔ خانقاہ میں ایک طالب علم مولوی قباد صاحب کی دستار بندی ہوئی تھی اس موقع پر خطاب فرماتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہر کام میں اس بات کو سوچنا چاہئے کہ یہ آخرت کے لیے مفید ہے یا مضر، اگر معین ہو، اس کو کیا جائے، اگر مضر ہو نہ کیا جائے۔ اس طرح ان شاء اللہ بہت جلد معاصی سے اجتناب کی ہمت پیدا ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ یہ کام آخرت کے لیے مفید ہے یا مضر۔

فقط خلیل احمد تھانوی

۲۲۔ ذیقعدہ ۱۴۴۰ھ

الاسعاد و الابعاد (آخرت کے لیے مفید و مضر کاموں کا استحضار)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	اظہار نعمت مامور بہ ہے	۸
۲	اخلاق رذیلہ اور اخلاق حمیدہ	۹
۳	مجاہدہ کی حقیقت	۱۰
۴	دعائے مغفرت مطلوب ہے	۱۰
۵	اجابت دعا کا صریح وعدہ	۱۲
۶	گناہ نہ ہونے کا علم نہ ہونا حقیقۃً درست نہیں ہوسکتا	۱۳
۷	احادیث دعا میں بہت علوم ہیں	۱۴
۸	کل جدید لذیذ پر ایک لطیفہ	۱۶
۹	غرباء کی اللہ کے یہاں قدر و منزلت	۱۷
۱۰	اہل لطائف کے ہاں معمولی باتیں بھی علمی مضامین بن جاتے ہیں	۱۹
۱۱	حکایت اقطاب ثلاثہ	۲۰
۱۲	لطیفہ الفاضل للقاسم	۲۱
۱۳	مزاح میں حسب موقع ایہام کی اجازت ہے	۲۲
۱۴	حرکت فی الزمان ممکن نہیں	۲۳
۱۵	سلوک میں ہر حال میں ترقی کرنے کی ضرورت	۲۵
۱۶	اہل جنت کے احوال	۲۷
۱۷	حضرت اکابر صوفیاء کی عمدہ لباس اور عمدہ غذا میں نیت	۲۸
۱۸	آثار رحمت کا مشاہدہ امر	۲۹
۱۹	مزاح کا اصل مقصد	۳۱
۲۰	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دبدبہ	۳۳
۲۱	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دبدبہ و ہیبت	۳۴
۲۲	حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ کا رعب و دبدبہ	۳۵
۲۳	حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن قدس سرہ کی تیزی	۳۵

۲۴	بزرگوں کے مزاح میں حکمت	۳۸
۲۵	انسان عالم اکبر ہے	۳۹
۲۶	ایک رند کی حکایت	۴۱
۲۷	ایک مراقبہ کا القاء	۴۲
۲۸	خشیت اعتقادی	۴۴
۲۹	وعظ الاسعاد والابعاد کا مفہوم	۴۶
۳۰	حضرت تھانوی کی اختصار پسندی	۴۶
۳۱	''اعیاہم'' میں ترتیب معراج	۴۷
۳۲	شاعروں کا مبالغہ	۴۸
۳۳	انطباق آیت متلوہ	۵۰
۳۴	صراط الرسول ﷺ دراصل صراط اللہ ہے	۵۳
۳۵	حق سبحانہ وتعالیٰ کی شان	۵۳
۳۶	مشائخ کا دامن صراط الرسول ﷺ پر چلنے کا وسیلہ ہے	۵۵
۳۷	حضرت مجدد قدس سرہ کا ایک واقعہ	۵۷
۳۸	بے خطر راستہ صراط حق ہے	۵۹
۳۹	وَصّٰکُم کا مفہوم	۶۰
۴۰	خلاصہ نجات	۶۱
۴۱	احکام شعبان	۶۲
۴۲	عمل قلیل کے دوام میں برکت	۶۴
۴۳	بدعات کا خاصہ	۶۷
۴۴	کھانے میں حضرت ضامن شہید کا اتباع سنت	۶۷
۴۵	دستار بندی وصیت عملی ہے	۷۰
۴۶	تینوں آیات کے آخر میں ذالکم وصکم کا عجیب نکتہ	۷۱
۴۷	گناہوں سے بچنے کی ہمت کے حصول کا آسان طریقہ	۷۲
۴۸	اخبار الجماعہ	۷۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

ا لحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارك وسلم اما بعد:

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

{وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡہُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمۡ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ}(۱)

تمہید

یہ ایک آیت ہے سورہ انعام کی اخیر کے قریب کی، اس کا مضمون ایسا عام اور کلی ہے کہ اس کی تفصیل اگر ساری عمر کی جائے اور وہ عمر بھی ایک شخص کی نہیں بلکہ ایک جماعت متعاقبہ کی (۱) عمر جو خود فی نفسہ متناہی (۲) ہو لیکن بمعنی لا تقف عند حد (کسی حد پر نہ ٹھہرے) غیر متناہی ہو اور اس کا ہر فرد اس کی تفصیل بیان کرنا شروع کرے پھر جہاں سے ایک نے چھوڑا ہو اس سے آگے دوسرا بیان کرے اسی طرح سب افراد بیان کرتے چلے جائیں جب بھی اس کی تفصیل ختم نہیں ہوسکتی کوئی حالت اور کوئی جزئی حادثہ اس آیت سے خارج نہیں بلکہ یہ سب کو مشتمل ہے اور حوادث کے احاطہ سے باہر ہونا ظاہر ہے۔ اس مضمون کے اختیار کرنے کی ضرورت ایک تو یہی ہے کہ مضمون عام ہے اور عام مضمون کا ضروری ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ سب کی ضرورت کا ہوا کرتا ہے تمام مخاطب اس میں بدرجہ مساوی شریک ہوتے ہیں۔

(۱) ''اور یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہ پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کردیں گی'' سورۃ الانعام: ۱۵۳ (۱) ایک جماعت کی عمر جو یکے بعد دیگرے شمار کی جائے (۲) ہر ایک کی انتہاء ہو۔

اظہار نعمت مامور بہ ہے

مگر عام ضرورت کے علاوہ ایک خاص سبب بھی اس کے اختیار کرنے کا ہے جس کو تحدیث بالنعمۃ(۱) کے طور پر عرض کرتا ہوں کیونکہ نعمت کا چھپانا ناشکری ہے اور نعمت کا ظاہر کرنا مامور بہ ہے(۲) چنانچہ ارشاد ہے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ(۳) دوسرے وہ نعمت سب کے نفع کی ہے(۴) تو اس کا چھپانا بے مروتی بھی ہے۔ اسی لیے مثل مشہور ہے کہ حلوا بہ نہتا بنایست خورد (تنہا حلوہ نہ کھانا چاہئے) اس بنا پر جی چاہا کہ اس نعمت سے اپنے دوستوں کو بھی خبر کردی جائے تاکہ وہ بھی اس علم عظیم سے نفع حاصل کریں۔ مگر جس طرح اظہار نعمت میں یہ مصلحت ہے اسی طرح اس میں کید نفس کا مفسدہ (۵) بھی ہے کیونکہ بعض دفعہ ہم نعمت الٰہی کو تحدیث بالنعمۃ سمجھ کر اس خیال سے بیان کرتے ہیں کہ اظہار نعمت کا نص (۶) میں امر ہے مگر اس میں نفس کا کید بھی خفی ہوتا ہے(۷) کہ اس طریقہ سے وہ اپنا کمال ظاہر کرنا چاہتا ہے اور نعمت سے عجب و کبر میں مبتلا ہوجاتا ہے اس طریق باطن میں اشتباہ اور تلبیس (۸) بے حد ہے۔ اخلاق حمیدہ اور اخلاق رذیلہ دونوں دوش بدوش (۹) چلتے ہیں ظاہر میں تحدیث بالنعمۃ اور دعویٰ کی صورت یکساں ہوتی ہے (تواضع وناشکری میں خلط ہے(۱۰) تادیب وتعنیف (۱۱) میں اشتباہ ہے۔ سیاست اور تحکم کی صورت یکساں (۱۲) ہوتی ہے لطافت وتن آرائی میں خلط ہے(۱۳) انتظام اور بخل کی صورت یکساں ہے غیرت وغضب (۱۴) ایک صورت سے ظاہر ہوتے ہیں استغناء اور تکبر (۱۵) میں بظاہر فرق نہیں معلوم ہوتا وغیرہ وغیرہ ۱۲ جامع) اسی لیے بعض دفعہ سالک پریشان ہوکر کہتا ہے۔

---

(۱) اللہ کے ایک انعام کو بیان کرنے کے لیے ذکر کرتا ہوں (۲) نعمت کے اظہار کا حکم ہے (۳) ''اور اپنے رب کے انعامات کا تذکرہ کرتے رہا کرو'' سورۃ الضحیٰ: ۴ (۴) فائدے (۵) اس میں نفس کی ایک مکاری بھی چھپی ہوتی ہے (۶) قرآن وحدیث میں حکم ہے (۷) پوشیدہ (۸) طریق تصوف میں اس قسم کے متشابہات بہت پیش آتے ہیں (۹) اچھے اور برے اخلاق ساتھ ساتھ ہوتے ہیں (۱۰) عاجزی اور ناشکری ایک دوسرے سے ملے جلے ہوتے ہیں (۱۱) سرزنش اور ملامت ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں (۱۲) سیاست اور حکم چلانے کی صورت یکساں ہوتی ہے (۱۳) خوش لباس اور دکھاوا ایک سا ہے (۱۴) انتظام سے خرچ کرنا اور بخل قریب قریب ہیں (۱۵) غیرت اور غصہ کا اظہار ایک ہی طرح ہوتا ہے (۱۶) بے نیازی اور تکبر قریب قریب ہیں۔

صد ہزاران دام ودانہ است اے خدا　　ماچو مرغان حریص بے نوا
دم بدم ما بستہ دام نویم　　ہر یکے گر باز وسیمرغے شویم
میرہانی ہر دمے مارا و باز　　سوئے دامے میرویم اے بے نیاز(۱)

مگر یہ نہیں ہے کہ واقع میں بھی فرق نہیں یا ایسا دقیق فرق ہے(۲) جس کو غور سے بھی نہ سمجھ سکے بلکہ دونوں میں قوی فاصل (۳) موجود ہے مگر اس فرق کے ادراک (۴) کے لیے اہتمام وفکر کی ضرورت ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

بحر تلخ وبحر شیریں ہمعناں　　درمیاں شاں برزخ لا یبغیاں(۵)

اخلاق رذیلہ اور اخلاق حمیدہ

بحر تلخ سے اخلاق رذیلہ(۶) مراد ہیں اور بحر شیریں سے اخلاق حمیدہ(۷) مولانا فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں ایک فاصل قوی ایسا موجود ہے جس کی وجہ سے ایک کی مجال نہیں کہ دوسرے میں مختلط ہوسکے جیسے کلکتہ وغیرہ میں سنا ہے کہ بحر تلخ وبحر شیریں(۸) کا اجتماع ہوا ہے اور میلوں تک دونوں میں اخلاط نہیں ہوا ایک طرف شیریں پانی ہے دوسری طرف شور ایک سے کھانا پک سکتا ہے اور دوسرے سے کسی کی دال نہیں گلتی ایسے ہی یہاں اخلاق حمیدہ ورذیلہ میں گو بظاہر اختلاط ہے مگر واقع میں ہر ایک جدا ہے۔ دونوں میں قوی فاصل موجود ہے جو حقیقی اختلاط سے مانع ہے مگر بعض اوقات صاحب معاملہ کو اس فاصل کا ادراک نہیں ہوتا اس کے لیے مبصر شیخ کی ضرورت ہے پس مولانا کا پہلا ارشاد یعنی صد ہزاران دام دانہ است الخ (لاکھوں جال ودانہ ہیں) صاحب واقعہ کے اعتبار سے ہے اور یہ ارشاد یعنی درمیان شاں برزخ لا یبغیان (درمیان میں ان کے ایسا پردہ حائل ہے کہ باہم مختلط نہیں ہونے پاتے) واقع کے اعتبار سے ہے خلاصہ یہ ہوا کہ اخلاق حمیدہ ورذیلہ میں واقع میں تو فرق ہے اور ایسا قوی فرق ہے کہ واقعیت کے لحاظ سے دونوں میں خلط کی

(۱) ''اے خدا یہ ہزاروں دام ودانہ ہیں اور ہم مثل مرغ حریص بے نوا ہیں دمبدم آپ کے دام میں پابستہ ہیں اگرچہ ہم سب شہباز سیمرغ ہیں ہر دم آپ ہم کو رہائی دیتے ہیں لیکن پھر بھی دام کی طرف دوڑتے ہیں'' (۲) باریک فرق (۳) دونوں میں بہت بڑا فرق موجود ہے (۴) فرق سمجھنے کے لیے (۵) ''بحر تلخ اور بحر شیریں برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشتبہ نہیں ہونے پاتے'' (۶) برے اخلاق (۷) اچھے اخلاق (۸) میٹھا اور کڑوا پانی ساتھ ساتھ دریا میں میلوں تک چلتے ہیں۔

گنجائش نہیں مگر صاحب واقعہ کو بعض دفعہ اس فاصل کا ادارک نہیں ہوتا اس لیے اس طریق میں خلط واشتباہ(۱) بہت واقع ہوجاتا ہے اور صاحب واقعہ کو بھی یہ اشتباہ قلت اہتمام(۲) کی وجہ سے ہوتا ہے اور اہتمام وفکر کے بعد اس کو بھی اشتباہ نہیں ہوتا کیونکہ اہتمام پر حق تعالیٰ کا وعدہ ہے رہبری کا۔

مجاہدہ کی حقیقت

چنانچہ ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا(۳) مجاہدہ کی حقیقت اہتمام ہی ہے جس پر حق تعالیٰ خود رہبری کا وعدہ فرمارہے ہیں۔ تو اب ان کی دستگیری(۴) کے بعد کون سی چیز مانع(۵) ہوسکتی ہے۔ کوئی نہیں پس یہ مسئلہ تو مسلم ہے کہ اہتمام ومجاہدہ کے بعد خلط نہیں(۶) ہوسکتا مگر ہم میں تو اہتمام ہی کی کمی ہے۔ اسی لیے ہم کو اخلاق رذیلہ وحمیدہ میں خلط ہوجاتا ہے ہمارا تحدیث بالنعمة ریاء وعجب سے مخلوط(۷)، ہماری تواضع ناشکری سے مشتبہ، ہمارا استغناء وتوکل تکبر سے ملتبس ہے۔ اس لیے میں حق تعالیٰ سے مدد لے کر اس نعمت کو بیان کرتا ہوں حق تعالیٰ خلط سے محفوظ رکھے اور اگر خلط ہوجائے تو حق تعالیٰ معاف فرمائیں کیونکہ ہم بہ نسبت حفاظت کے معافی ومغفرت کے محتاج زیادہ ہیں کیونکہ حفاظت کے اہل وہ حضرات ہیں جو گناہوں سے معصوم ہیں اور ہم گناہوں سے محفوظ نہیں ہیں اس لیے مغفرت کے زیادہ محتاج ہیں دوسرے طلب مغفرت میں اپنا ایک عجز ونیاز وضعف ظاہر ہوتا ہے جو طلب حفاظت میں حاصل نہیں ہے اور بندہ سے عجز ونیاز ہی مطلوب ہے۔ اس لیے ہماری خیریت اسی میں ہے کہ اپنے کو گنہگار سمجھ کر مغفرت طلب کرتے ہیں۔

دعائے مغفرت مطلوب ہے

اس وقت مجھے یاد آ گیا قصہ حضرت ابراہیم بن ادہم کا کہ ایک مرتبہ انہوں نے دعا کی اَللّٰهُمَّ اعْصِمْنِي (کہ اے اللہ مجھے گناہوں سے بچایئے) ارشاد ہوا کہ اگر سب

(۱) ان صفات کو پہچاننے میں عام طور پر غلطی ہوجاتی ہے (۲) اہتمام کی کمی کے باعث (۳) ''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے خود دکھلادیں گے'' سورہ عنکبوت:۶۹ (۴) ہاتھ پکڑنے کے بعد (۵) رکاوٹ (۶) یہ بات طے شدہ ہے کہ اہتمام کرنے کے بعد ان صفات میں خلط نہیں ہوتا (۷) ہمارے اظہار نعمت میں عجب اور بڑائی مل جاتی ہے۔

یہی دعا کرنے لگیں تو رحمت ومغفرت کا ظہور کہاں ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ میری مغفرت کر) کیوں نہیں کہتے وہ، اس میں بتلادیا گیا ہے کہ جس طرح حفاظت مطلوب ہے مغفرت بھی مطلوب ہے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا لَوْلَمْ تُذْنِبُوْا لَجَاءَاللّٰہُ بِقَوْمٍ یُذْنِبُوْنَ فَیَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰہ فَیَغْفِرُ لَھُمْ (۱) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گناہ ہم سے مقصود ہے اور حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہم گناہ کیا کریں۔ بلکہ گناہ سے جو ضعف وعجز ظاہر ہوتا ہے (۲) وہ مقصود ہے پس اگر کہیں بدون صدور (۳) گناہ ہی کے یہ ضعف وعجز پیدا ہوجائے جیسے انبیاء علیہم السلام باوجود عصمت کے جس قدر اپنے کو گنہگار خطاوار سمجھتے ہیں ہم گنہگار ہوکر بھی اپنے کو اتنا گنہگار نہیں سمجھتے اور جس قدر وہ حق تعالیٰ سے خوف وخشیت رکھتے ہیں ہم مجرم ہوکر بھی اتنا تو کیا اس کا ہزارواں حصہ بھی خوف نہیں رکھتے۔ تو اگر ہم لوگ گناہوں میں مبتلا نہ کئے جاتے تو نہ معلوم ہماری کیا حالت ہوتی جب ہم گنہگار ہوکر بھی اپنے کو کچھ زیادہ گنہگار نہیں سمجھتے تو معصوم (۴) ہوکر نہ معلوم ہم اپنے کو کیسا کچھ مقدس سمجھتے اور ہمارے عجب (۵) کی کیا حالت ہوتی۔ اس لیے کبھی کبھی ہم کو گناہ میں مبتلا کردیا جاتا ہے۔ جس سے ہمارا وہ عجب توڑ دیا جاتا ہے جو طاعات واذکار سے کبھی پیدا ہونے لگتا ہے (۶) اور وہ خیال تقدس (۷) پارہ پارہ ہوجاتا ہے جو کچھ دنوں تہجد اور مراقبات کی پابندی سے دل پر گزرنے لگتا ہے تو جیسے ہم کو حفاظت حق کی ضرورت ہے اسی طرح مغفرت کی بھی ضرورت ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم بن ادہم کو تنبیہ کی گئی کہ محض عصمت کی دعا کیوں کرتے ہو۔ اس کے ساتھ دعائے مغفرت کیوں نہیں ملاتے۔ اس کے علاوہ اللھم اعصمنی (اے اللہ مجھے گناہوں سے بچایئے) کے ساتھ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے رب مجھے بخش دیجئے) ملانے میں ایک اور بھی حکمت ہے جس پر نظر کرکے اس کا ملانا بہت ہی ضروری ہوگیا وہ یہ کہ سب مسلمانوں کا عقیدہ ہے حق تعالیٰ مجیب الدعوات ہیں۔

---

(۱) ''اگر تم گناہ نہ کرو تو حق تعالیٰ ایسی جماعت کو پیدا کریں گے جو گناہ کریں پھر استغفار کریں اور ان کی مغفرت کی جائے ۱۲'' (۲) اپنی کمزوری اور عاجزی کا اظہار ہوتا ہے (۳) بغیر گناہ کئے ہی یہ عاجزی ظاہر ہو (۴) گناہوں سے محفوظ ہوکر (۵) تکبر (۶) وہ تکبر توڑ دیا جاتا ہے جو کثرت عبادت کرنے سے ہونے لگتا ہے (۷) نیکی کا خیال۔

اجابت دعا کا صریح وعدہ

چنانچہ جو لوگ دعا قبول نہ ہونے کے شاکی بھی ہوتے ہیں وہ یہ تو کہا کرتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی مگر یہ کسی کو کہتے ہوئے نہیں سنا گیا کہ دعا قبول ہونے کا وعدہ کہاں ہے بلکہ اس کا سب کو اعتقاد ہے کہ دعا قبول کرنے کا وعدہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کا انکار کیونکر ہوسکتا ہے جبکہ قرآن میں صریح ارشاد موجود ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری اجابت کروں گا) رہا یہ اشکال کہ جب اجابت دعا کا صریح وعدہ ہے تو پھر اس میں تخلیف (۱) کیوں ہوتا ہے اس کے جواب بہت سے ہیں مگر ان کی گنجائش کہاں، سہل بات وہ ہے جس کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ دعا کو قبول فرماتے ہیں پھر کبھی تو جلدی وہی مطلوب عطا فرمادیتے ہیں جو مانگا گیا ہے اور کبھی دیر سے عطا فرماتے ہیں کہ اس میں مصلحت ہوتی ہے اگر اس مطلوب کا دنیا میں دینا مصلحت نہیں ہوتا تو اس کو آخرت کے لیے ذخیرہ کے طور پر جمع رکھتے ہیں جب بندہ قیامت میں حاضر ہوگا سب دعاؤں کا ثواب اس کے سامنے کردیا جائے گا بہرحال اجابت دعا امر ضروری ہے، ایک مقدمہ تو یہ ہوا اس کے ساتھ ایک دوسرا مقدمہ یہ ملایا جائے کہ دعا کے وقت اس اعتقاد کا بھی حکم ہے، میری یہ دعا ضرور قبول ہوگی حدیث میں ہے: اُدْعُوا اللّٰہَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ (۲) اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور تم قبولیت دعا کا یقین بھی رکھو۔ اب بتلاؤ کہ اگر اللھم اعصمنی کے ساتھ اللھم اغفرلی نہ بڑھایا جائے تو یہ شخص تو اس دعا کے بعد اپنے تقدس کا معتقد ہوگا کیونکہ وہ کہے گا کہ میں نے اپنے لیے عصمت کی دعا کی اور دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور مجھے اعتقاد اجابت کا امر بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ میں اپنے کو معصوم مقدس نہ سمجھوں۔ حق تعالیٰ نے اس الہام میں اللھم اغفرلی بڑھا کر اس اشکال کو رفع فرمادیا اور بڑا علم عظیم عطا فرمایا کہ تم دعائے عصمت کے ساتھ دعائے مغفرت بھی کیا کرو۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ اول تو مجھے گناہوں سے بچایئے اور اگر ابتلا ہی مقدر ہے تو مغفرت فرمایئے اس مجموعہ کے

(۱) اس کے خلاف کیوں ہوتا ہے (۲) سنن الترمذی: ۳۴۷۹

اعتقاد میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اب خیال تقدس کسی طرح پیدا نہیں ہوسکتا۔ سبحان اللہ ایک لفظ بڑھا کر کتنے بڑے پہاڑ کو گرادیا یہ ہیں وہ الہامات جن کو الہام کہنا چاہئے۔ یہ مضمون کچھ اس الہام ہی پر موقوف نہیں الہام کیسا خود نص میں بھی اس کی تعلیم موجود ہے حضور ﷺ نے جہاں یہ دعا فرمائی ہے اَللّٰھُمَّ قنی شَرَّ نَفْسِیْ (۱) وہی یہ دعا بھی موجود ہے اللھم اغفرلی ذنبی (اے اللہ میرے گناہ معاف کردیجئے) بلکہ نص میں ایک بات اور زیادہ ہے جس کا اس الہام میں پتا نہیں وہ یہ کہ آپ نے دعائے مغفرت میں یہ قید بھی زیادہ فرمائی ہے۔

گناہ نہ ہونے کا علم نہ ہونا حقیقۃً درست نہیں ہوسکتا

مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَالَمْ اَعْلَمْ اے اللہ میرے سب گناہ بخش دے وہ بھی جن کو میں جانتا ہوں اور وہ بھی جن کو نہیں جانتا اس میں ان لوگوں کا دعویٰ توڑ دیا گیا جو چند موٹے موٹے گناہوں سے محفوظ ہوکر تقدس کے مدعی ہیں۔ اس جملہ نے بتلادیا کہ عدم علم عدم کو مستلزم نہیں (۲) پس اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ تمہارے علم میں تمہارے سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تو یہ کیا ضرور ہے کہ واقع میں بھی سرزد نہ ہوا ہو اور اس کی ضرورت تو تنزل کے بعد ہے ورنہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ انسان کو اپنے اندر گناہ نظر نہ آئیں ادنیٰ تامل سے انسان اپنی خطاؤں کو سمجھ سکتا ہے۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (۳) ہاں کوئی آنکھیں ہی بند کرلے تو اس کا علاج نہیں اس کے لیے بسبیل تنزل وہ جواب ہے (۴) جو حدیث کے اس جملہ میں دیا گیا ہے مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَالَمْ اَعْلَمْ (وہ بھی جس کو میں جانتا ہوں اور وہ بھی جس کو میں نہیں جانتا) یعنی تمہارا عدم علم عدم کو تو مستلزم (۵) نہیں پس یہی سمجھ کر اپنے کو گناہ گار جانتے رہو کہ شاید تجھ سے کوئی ایسا گناہ ہوا ہو جس کی مجھے خبر نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ حدیث میں اس کی ایک واضح نظیر بھی مذکور ہے حدیث میں آتا ہے: یتکلم احدکم بکلمة لا یلقی لها بالا یحطه اللّٰه بها الی النار سبعین خریفاً ویتکلم احدکم بکلمة لا یعدها شیئًا یرفع اللّٰه بها له

(۱) ''اے اللہ مجھ کو میرے نفس کے شر سے بچایئے'' کنزالعمال: ۳۶۹۵ (۲) کسی چیز کا اگر ہمیں علم نہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ چیز موجود ہی نہیں ہے (۳) ''بلکہ انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا گو اپنے حیلے پیش لاوے'' سورۃ القیامۃ: ۱۴ (۴) ایسے شخص کے لیے آخری درجہ کا وہ جواب ہے جو حدیث میں ہے (۵) تمہارے علم میں نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گناہ ہوا ہی نہیں

درجات فی الجنۃ او کما قال بعض تم میں سے ایک بات کہتا ہے جس کی طرف قلب کو التفات بھی نہیں ہوتا مگر حق تعالیٰ اس ایک بات کی وجہ سے اس کو جہنم میں بہت دور پھینک دیتے ہیں اور بعض آدمی ایک بات کہتا ہے جس کی کچھ وقعت اس کے نزدیک نہیں ہوتی اور حق تعالیٰ اس کی وجہ سے بہت درجے جنت میں اس کے بلند کر دیتے ہیں۔ غور کیجئے دوسرے گناہوں کا یاد نہ رہنا تو شاید محل کلام بھی ہو مگر زبان کے گناہوں میں ایسا ہوجانا تو کچھ بھی بعید نہیں کیونکہ وہ واقعہ ہے کہ ہم لوگ روانی کلام میں بہت سی باتیں بلا قصد وارادہ کے کہہ جاتے ہیں جن پر اصلاً التفات نہیں ہوتا کہ ان کا اثر کیا ہوا ہوگا تو ذنوب لسان (۱) کا ہم کو یاد نہ رہنا کیا بعید ہے۔ کچھ بھی نہیں پس اب کسی کو بھی دعویٰ تقدس کا منہ نہیں رہا۔

احادیث دعا میں بہت علوم ہیں

یہاں سے اہل علم کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ احادیث دعا میں بھی بہت علوم ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ علوم سلوک تو اکثر (۲) احادیث دعا ہی میں بھرے ہوئے ہیں مگر ان احادیث کو اہل علم ایسی بے توجہی سے پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس کی کچھ حد نہیں اس لیے ہم لوگ بہت سے علوم سے محروم ہیں۔ الغرض چونکہ دعویٰ کبھی بصورت تحدیث بالنعمۃ ہوتا ہے اس لیے میں نے دعائے حفاظت کے ساتھ دعائے مغفرت کو بھی منضم کرلیا (۳) کہ اگر خدانخواستہ مجھ سے خلط ہوجائے تو حق تعالیٰ اس گناہ کو معاف فرمائیں۔ اس تمہید کے بعد میں حق تعالیٰ پر توکل کرکے اور ان کی امداد طلب کرکے اس نعمت کو بیان کرتا ہوں۔ وہ نعمت یوں تو نئی نہیں ہے بلکہ پرانی ہے اور ہر مسلمان کو حاصل ہے مگر بعض دفعہ ایک وارد کسی خاص حالت میں آتا ہے تو نیا معلوم ہوا کرتا ہے جیسے آج جمعہ کا دن ہے سب لوگ نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو گو اس جدت لباس سے یہ لوگ بدل نہیں گئے بلکہ سب وہی ہیں جو ایک گھنٹہ پہلے تھے مگر پھر بھی ہر شخص میں ایک جدت ضرور معلوم ہوتی ہے اور یوں خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص ہی بدل گیا ہے۔ اور قاعدہ ہے کل جدید لذیذ۔

(۱) زبان کے گناہ (۲) تصوف وسلوک کے اکثر علوم (۳) ملالیا

(ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) اس لیے گو وہ نعمت فی نفسہ پرانی ہے مگر اس زمانہ قریب میں وہ جس شدت وجدت کے ساتھ قلب پر وارد ہوئی ہے اس طرح پہلے وارد نہ ہوئی تھی اس لیے وہ مجھے نئی نعمت معلوم ہوتی ہے اور اسی لیے جو لذت وحظ (۱) اور جو اثر میرے قلب پر اس وقت ہے وہ ویسا ہی ہے جو نعمت جدیدہ سے ہوا کرتا ہے۔ جمعہ کے دن کپڑے بدلنے سے اشخاص میں جدت معلوم ہونے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہمارے یہاں خانقاہ میں ایک صاحب رہتے تھے جو متعلم بھی تھے ایک دن میں نے ایک مہمان کو دکھلا کر ان سے کہا کہ میں ان کا کھانا گھر سے بھیجتا ہوں تم ان کو کھلا دینا اور بتلا دیا کہ وہ مہمان یہ ہیں ان کو پہچان لو اس وقت وہ مہمان اتفاق سے ایک چادر اوڑھے ہوئے تھے میں مکان کہہ کر آ گیا کچھ دیر کے بعد ان صاحب کا کھانا آیا متعلم صاحب کھانا لے کر خانقاہ میں ان مہمان کو تلاش کرنے لگے جب وہ نہ ملے تو میرے پاس آئے کہ مہمان تو نہ معلوم کہاں چلے گئے ملتے نہیں حالانکہ اس وقت وہ مہمان میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے میں نے کہا بندہ خدا یہ تو بیٹھے ہیں تو وہ کیا کہتے ہیں کہ یہ چادر تو اوڑھے ہوئے ہیں نہیں (اس وقت مہمان نے گرمی کی وجہ سے چادر اتار دیا تھا) میں نے ان مہمان سے کہا کہ حضرت جب آپ کہیں جایا کریں تو اول سے آخر تک ایک ہی لباس میں رہا کریں یا کم از کم کھانے کے وقت تو وہی لباس پہن لیا کریں جس میں اول آپ وارد ہوا کریں ورنہ بھوکے مر جاؤ گے۔ کیونکہ دنیا میں ایسے بھی عقلاء ہیں جن کے نزدیک چادر اتار دینے سے آدمی بدل جاتا ہے تو ہمارے ان دوست نے چادر کے نہ ہونے سے مہمان کو نیا آدمی سمجھا اور اس کا یہ خیال گو ہمارے نزدیک حماقت ہو مگر فلاسفہ کی تحقیق پر منطبق ہے کیونکہ فلاسفہ کے نزدیک اعراض کے بدلنے سے تشخص بدل جاتا ہے اور اعراض میں ایک عرض مقولہ ملک اور ایک عرض مقولہ جدہ بھی ہے۔ جن کے تبدل سے تشخص معروض بدل جاتا ہے خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا مقصود میرا یہ ہے کہ جدت حال سے ذوالحال میں بھی گو نہ جدت آجاتی ہے (۲) (گو اس درجہ کی جدت نہ ہو جیسی ہمارے ان دوست نے سمجھی تھی کہ چادر اتار دینے سے مہمان کے وجود ہی کی نفی کر دی) اور قاعدہ ہے کل جدید

(۱) لذت ومزہ (۲) حال کے بدلنے سے صاحب حال میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلی آتی ہی ہے۔

لذیذ (ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) اس لیے مجھے اس نعمت سے وہی حظ حاصل ہو رہا ہے جو جدید نعمت سے ہوا کرتا ہے۔

کل جدید لذیذ پر ایک لطیفہ

کل جدید لذیذ پر مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا ایک لطیفہ مجھے یاد آ گیا۔ مولانا کی عادت تھی کہ غریبوں کو تو مہمانی میں پلاؤ قورمے کھلاتے تھے اور امیروں کو دال، ساگ۔ مولانا کا مقصود تو اس سے اور ہی کچھ تھا وہ یہ کہ مولانا کی نظر میں اغنیا کی قدر نہ تھی غریبوں کی قدر تھی اس لیے غریبوں کی خاطر مدارات امیروں سے زیادہ کرتے تھے اور یہ سنت اللہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ فقراء مہاجرین کو اغنیاء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل کریں گے تو خدا کے نزدیک غرباء کی اتنی قدر ہے مگر اب یہ رنگ ہے کہ ایک غریب مجھ سے کہتے تھے کہ آج کل تو غریبوں کی بہت ہی مٹی پلید ہے اب تو اگر کسی امیر سے ریح صادر ہو جائے (۱) تو کہتے ہیں مبارک ہو صحت ہوئی اور غریب سے صادر ہو جائے تو اس کو دھمکاتے اور مجلس سے نکال دیتے ہیں کہ کمبخت نے سڑا دیا، دماغ پاش پاش کر دیا حالانکہ غریبوں سے امیروں کی ریح زیادہ سڑی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ وہ مرغن غذا اور مختلف قسم کے کھانے کھاتے ہیں جس سے معدہ سخت متعفن ہو جاتا ہے غریبوں کے معدے ایسے متعفن نہیں ہوتے کیونکہ اول تو وہ سادہ غذا کھاتے ہیں پھر وہ بھی معدہ میں باقی نہیں رہتی دو چار دفعہ ہل جانے سے سب ہضم ہو جاتی ہے مگر بایں جملہ امیروں کی ریح سے کسی کا دماغ نہیں پھٹتا اور غریبوں سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ یہ زمانہ کا اثر ہے کہ آج کل غریبوں کی بے قدری بہت ہے مجھے اس مبارک اور صحت ہونے پر ایک حکایت یاد آئی ایک دفعہ میں ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، وہاں ایک صاحب نے زور سے ریح صادر کی لوگوں کو ناگوار ہوا تو انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

چو باد اندر شکم پیچد فروہل　　کہ باد اندر شکم باریست بردل (۲)

کہنے لگے دیکھئے شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ جب پیٹ میں گڑبڑ ہو تو ہوا چھوڑ

(۱) کسی امیر آدمی کی ہوا نکل جائے (۲) ”جب ریح پیٹ میں گھولے چھوڑ دے کہ ریح پیٹ کے اندر ایک بوجھ ہے دل پر“

دینی چاہئے میں نے اس پر عمل کیا ہے پھر ناگواری کی کیا وجہ میں نے کہا کہ شیخ نے اس شعر میں یہ کہاں فرمایا ہے کہ زور سے چھوڑا کرو کہنے لگے کہ اس شعر میں گو اظہار واخفاء کی تصریح نہیں جس قصہ میں یہ شعر ہے اس میں وقوع اعلان ہی کے ساتھ ہوا تھا جبھی تو ان کو اس معذرت کی ضرورت ہوئی آہستہ صدور ہوا ہوتا تو اہل مجلس سے عذر خواہی کی ان کو کیا ضرورت تھی اس وقت تو مجھے ان کی بات کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور میں ہار گیا اور وہ دونوں راستوں سے جیت گئے اوپر کے راستہ سے بھی اور نیچے کے راستہ سے بھی (اوپر کے راستہ سے حجت ودلیل کے ساتھ جیتے اور نیچے کے راستہ سے تو جیتے ہوئے تھے ہی کہ سب کو بدبو سے دبادیا) بعد میں ان کی دلیل کا جواب میری سمجھ میں آیا کہ وہاں تو زور سے اتفاقاً ہوا تھا اور یہاں ان صاحب نے قصداً زور سے کیا تھا یہ فرق ہے اس قصہ میں اور ان کے فعل میں اور واقعی قصداً زور سے ریح صادر کرنا خصوصاً مجمع میں بہت ہی نازیبا حرکت اور آدمیت کے خلاف ہے۔ ہمارے یہاں ایک میاں جی تھے جو لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے لڑکے بے تمیز تو ہوتے ہی ہیں۔ وہ مکتب ہی میں ریح صادر کردیتے ہیں میاں جی نے کہا بہت نالائق حرکت ہے سارا مکتب اس سے سڑ جاتا ہے، اب سے جس کی ریح آئے وہ باہر جا کر چھوڑا کرے۔ پھر یہ فکر ہوئی کہ اس کے لیے کس لفظ سے اجازت لی جائے تو میاں جی نے یہ تجویز کیا کہ جب اس کام کے لیے کوئی جایا کرے تو وہ یہاں کہا کرے کہ میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں، یہ میاں جی بھی ایسی باتوں میں مجتہد ہوتے ہیں کیا لفظ بامعنی نکالا ہے۔ بس اب کیا تھا۔ لڑکوں کے ایک کھیل ہاتھ آگیا تھوڑی تھوڑی دیر میں ایک اٹھتا دوسرا اٹھتا تیسرا آتا کہ میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں، میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں، آخر میاں جی تنگ آگئے اور جھلا کر کہنے لگے کہ بس یہیں چھوڑ دیا کرو۔

غرباء کی اللہ کے یہاں قدر ومنزلت

یہ قصہ اس پر چلا تھا کہ آج کل غریبوں کی بہت بے قدری ہے مگر خدا کے یہاں ان کی قدر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں یہ قدر تھی کہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو

وصیت فرماتے ہیں۔ یا عائشۃ رضی اللہ عنہا جالسی المساکین وقربیھم (۱) اے عائشہ مساکین کے پاس بیٹھا کرو اور ان کو اپنے سے قریب کرو نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں فرماتے تھے اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْناً وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ (۲) اے اللہ مجھے زندگی میں بھی مسکین رکھئے اور موت بھی مسکینی کی حالت میں دیجئے قیامت میں بھی مساکین کی جماعت میں اٹھایئے۔ سبحان اللہ کس قدر آپ کو مساکین سے محبت تھی کہ اپنے لیے انہی کا ساتھ پسند فرماتے تھے اس میں بعض لوگوں نے یہ نکتہ بھی نکالا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا میں مساکین کو اپنے اوپر بھی ترجیح دی ہے کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ مساکین کا حشر میرے ساتھ کیجئے بلکہ یہ فرمایا کہ میرا حشر مساکین کیساتھ کیجئے جس میں اپنے کو تابع اور مساکین کو متبوع قرار دیا گیا ہے مگر میرے جی کو یہ نکتہ نہیں لگا کیونکہ گو آپ نے دعا اس لفظ سے فرمائی ہے مگر حقیقت میں مساکین ہی کا حشر آپ کے ساتھ ہوگا وہی تابع ہوں گے اور آپ متبوع ہوں گے مساکین کی متبوعیت کا کسی درجہ میں بھی وہم نہیں باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان الفاظ سے دعا فرمانا تواضع کی بناء پر ہے اسی سنت اللہ وسنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب پر تھا کہ آپ کی نظر میں غربا کی قدر زیادہ تھی اس لیے آپ ان کو پلاؤ زردہ اور قورمہ کھلاتے تھے اور امراء کی قدر نہ تھی اس لیے ان کو ساگ اور دال کھلاتے اصل وجہ تو یہ تھی مگر جب لوگوں نے آپ سے اس نرالے برتاؤ کی وجہ دریافت کی تو آپ نے اصل بات نہیں بتلائی کیونکہ اس کے اظہار میں امراء کی دل شکنی (۳) اور غرباء کے اعجاب (۴) کا خطرہ تھا آپ نے اس کی دوسری وجہ بتلائی فرمایا کہ قاعدہ کل جدید لذیذ نئی چیز لذیذ ہوا کرتی ہے اس لیے میں اپنے مہمانوں کو جدید چیز کھلاتا ہوں تاکہ ان کو لذت حاصل ہو غریبوں کے لیے تو پلاؤ زردہ قورمے جدید ہیں جو ان بیچاروں کے خواب میں بھی کبھی نہیں آتے ان کو تو یہ کھلاتا ہوں امیروں کو چٹنی، ساگ، دال کھلاتا ہوں کیونکہ ان کے حق میں یہی جدید ہیں جو عمر بھر ان کے کھانے میں نہیں آتے ان کو انہیں میں لذت حاصل ہوتی ہے۔ پلاؤ زردہ تو روز کھاتے رہتے ہیں وہ ان کے لیے جدید نہیں۔ اہل لطائف کے یہاں معمولی باتیں

(۱) البدایہ والنہایۃ: ۶/ ۵۹ (۲) سنن الترمذی: ۵۲ ۲۳ (۳) دل آزاری (۴) تکبر میں مبتلا ہونے کا

بھی عملی مضامین بن جاتے ہیں۔ سبحان اللہ اب یہ ایک علمی مضمون ہو گیا حالانکہ ظاہر میں معمولی بات تھی۔

اہل لطائف کے یہاں معمولی سے معمولی باتیں بھی علمی مضامین بن جاتے ہیں

چنانچہ اس پر مولانا ہی کا ایک اور قصہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ مولانا کی مجلس میں احباب مجتمع تھے اور سنا ہے کہ جب ان حضرات کا اجتماع ہوا کرتا تھا تو اکثر مٹھائی کی فرمائش ہوا کرتی تھی کہ بھائی مٹھائی کھلاؤ چنانچہ اس وقت بھی اس کی فرمائش ہوئی اور راز اس میں یہ ہے کہ حضرات اہل اللہ میں ذکر کے انوار سے نشاط کا غلبہ ہوتا ہے اس لیے وہ اسباب نشاط کو اہل دنیا سے زیادہ برتتے ہیں دنیاداروں کو اس قدر اسباب نشاط میسر نہیں ہوتے جو ان حضرات کو میسر ہوتے ہیں دنیاداروں کو اپنے افکار ہی(۱) سے فرصت نہیں ملتی اور اگر کبھی یہ لوگ اسباب نشاط اختیار کرتے ہیں تو بھی ایسے ہوتے ہیں جو فکر سے خالی نہیں ہوتے مثلاً گانا بجانا، شطرنج اور گنجفہ کھیلنا جو خلاف شریعت ہیں اور گناہ کو مستلزم اور ظاہر ہے کہ مسلمان کو گناہ کرتے ہوئے خدا کا خوف ضرور ہوتا ہے خواہ کسی درجہ کا خوف ہو پھر خوف کے ساتھ لذت کہاں اور حضرات اہل اللہ کے یہاں اسباب نشاط سب شریعت کے موافق ہوتے ہیں جن میں گناہ کا خطرہ نہیں ہوتا۔ ادھر ان کا دل افکار دنیا سے خالی ہوتا ہے اس لیے ان کو دنیا والوں سے زیادہ نشاط میسر ہوتا ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ اہل اللہ کو آخرت کا تو غم ہوتا ہے پھر وہ بھی فکر سے خالی نہ ہوئے تو ان کا نشاط بھی کامل نہ ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ فکر آخرت لذیذ فکر ہے جس سے نشاط بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا (اس کی ایسی مثال ہے جیسے عاشق کو محبوب کی رضا کی فکر ہوا کرتی ہے رات دن وہ اسی طرح سوچ میں رہتا ہے کہ ایسا کونسا کام کروں جس سے محبوب راضی ہو مگر یہ فکر لذیذ ہوتا ہے جس کی لذت عشاق کے دل سے پوچھو۔ عاشق اس فکر سے کبھی خلاصی کا طالب نہیں ہوتا مجنون کہتا ہے۔

یارب لا تسلبنی حبها ابدا　　و یرحم اللّٰه عبدا قال امینا(۲)

(۱) جن پر گناہ ملتا ہے (۲) ''اے اللہ لیلیٰ کی محبت ہمیشہ رہے مجھ سے سلب نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے جو شخص آمین کہے''۔

اور کہتا ہے:

الھی تبت من کل المعاصی ولکن حب لیلیٰ لا اتوب(۱)

حالانکہ محبت لیلیٰ نے اس کے دل کو جلا پھونک دیا تھا مگر اس پر بھی وہ اس کے زوال کا طالب نہیں بلکہ ترقی کا خواہاں ہے اور یہ مثال بہت ہی ناقص ہے کیونکہ مجنون کا یہ عشق خطرہ آخرت سے خالی نہ تھا اس پر اس عشق کو کیونکر قیاس کیا جاسکتا ہے جس میں لذت ہی لذت ہے خطرہ کا نام نہیں مگر سمجھانے کے لیے ایک مثال ناقص بھی کافی ہے۔

حکایت اقطاب ثلاثہ

ہم نے ثقات سے سنا ہے کہ جب حاجی صاحب قدس سرہ تھانہ بھون تشریف رکھتے تھے تو صبح کو اشراق وغیرہ سے فارغ ہوکر اپنے حجرہ میں سے مٹھائی کی ہنڈیا نکالتے اور حضرت حافظ ضامن صاحب شہید قدس سرہ اور مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ حضرات سب مل کر مٹھائی کھایا کرتے تھے پھر اس میں باہم چھینا جھپٹی بھی ہوتی تھی کوئی ہنڈیا اٹھا کر بھاگ جاتے، دوسرے حضرات ان کے پیچھے دوڑتے حالانکہ یہ حضرات اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت مشائخ تھے مگر ان کی معاشرت ایسی سادہ تھی جس میں تصنع وتکلف کا نام نہ تھا۔ بھلا آج کل تو مشائخ ایسا کرکے دکھلائیں توبہ، ان کی شان گھٹ جائے گی متانت ووقار کے خلاف ہوجائے گا۔

چنانچہ ہمارے یہاں ایک شخص تھا وہ کہا کرتا تھا کہ علماء ومشائخ کو متانت ووقار سے رہنا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا وقار اسی کو مبارک ہو ہم تو اس کو تکبر سمجھتے ہیں ہمیں چھچھورے پن ہی میں رہنے دو اور جو کوئی ہمیں چھچھورا کہے کہو۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را (۲)

اور

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار کار ملک است آن کہ تدبیر وتامل بایدش(۳)

(۱) ''اے اللہ میں گناہوں سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا'' (۲) ''اگرچہ عاقلوں کے نزدیک بدنامی ہے ہم ننگ ونام کے خواہاں نہیں ہیں'' (۳) ''رند عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل وتدبر کرنا چاہئے''

جس کو مریدوں اور معتقدوں کی فوج جمع کرنا ہو وہ اس متانت ووقار کو اختیار کرے اور جس کو جلانا پھونکنا اور جلنا مرنا منظور ہو اس کو ان اسباب وقار کی ضرورت نہیں بس اس کو ضرورت ہے کہ خلاف رضا محبوب کوئی کام نہ ہو جو کام ہو شریعت کی حد کے اندر ہو اس کے بعد اس کو کسی کی فکر نہیں چاہئے کوئی اس کے ساتھ رہے یا نہ رہے اور میاں جس کو حق تعالیٰ عظمت دیتے ہیں اسکی عزت ان باتوں سے کم نہیں ہوا کرتی کہ ذرا ہنسی کی باتیں کرلیں دوستوں سے چھینا جھپٹی کرلی بھاگ دوڑ لئے، جس کی عزت موہوب نہ ہو مکسوب ہو(۱) وہ بیشک متانت ووقار ہی سے بنتی ہے تو لعنت ہے ایسی عزت پر جس کے لیے انسان کو کوشش وسعی کرنا پڑے۔

لطیفہ الفاضل للقاسم

غرض مولانا محمد قاسم صاحب سے احباب نے فرمائش کی کہ مٹھائی کھلایئے۔ مولانا نے ایک روپیہ کی مٹھائی منگوائی اور اپنے ایک مقرب خادم کو جن کا نام مولوی فاضل تھا تقسیم کے لیے فرمایا چنانچہ وہ تقسیم کر چکے تو مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک لطیفہ فرمایا الفاضل للقاسم یہ جملہ ذو معانی ہے اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جو بچ جائے وہ تقسیم کرنے والے کا ہے (یعنی مولوی فاضل کا) یہی معنی مولانا کا نام قاسم تھا۔ اس صورت میں فاضل بمعنی لغوی ہے۔ اور قاسم بمعنی عرفی (۲) اور تیسرے معنی یہ ہیں کہ فاضل یعنی مسمی بہ فاضل قاسم کے ہیں یعنی تم میرے ہو اس صورت میں فاضل وقاسم دونوں بمعنی عرفی مستعمل ہوں گے۔ مولوی صاحب نے موقعہ اور اجازت دیکھ کر جواب دیا الفاضل للفاضل والقاسم محروم یہ جملہ بھی ذو معنین ہے اس میں اگر فاضل وقاسم دونوں بمعنی لغوی لئے جائیں تو معنی یہ ہیں کہ بچا ہوا اس شخص کا ہے جو فاضل ہے (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب کیونکہ صاحب فضیلت وہی تھے) اور تقسیم کرنے والا محروم ہے (یعنی مولوی فاضل محروم ہیں کیونکہ وہی تقسیم کررہے تھے) اور یہ مثل بھی ہے القاسم محروم تو جس میں قاسم بمعنی لغوی مستعمل ہے اور یہی معنی مولوی فاضل صاحب کے مراد تھے لیکن مزاح کے طور پر ایک معنی بھی اس جملہ کے ہو سکتے جبکہ

(۱) جس کی عزت اللہ کی عطا کردہ نہ ہو بلکہ خود ساختہ ہو (۲) یعنی جو بچ جائے وہ مولانا قاسم صاحب کے لیے ہے۔

فاضل وقاسم کو بمعنی عرفی لیا جائے وہ یہ کہ بچا ہوا فاضل ہے۔ (یعنی مسمی بہ فاضل کا) اور قاسم محروم ہیں (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب اہل اللہ کے خدام مودب ہوتے ہیں بے ادب نہیں ہوتے مگر بے ادبی اسے کہتے ہیں جس سے مخدوم کو تکلیف ہو)۔ چونکہ مولوی فاضل صاحب جانتے تھے کہ اس وقت حضرت مولانا کی طبیعت مزاح کو چاہ رہی ہے اس لیے انہوں نے اجازت پاکر ذو معنیین (۱) جملہ استعمال کر دیا سو اس کا مضائقہ نہیں نہ یہ بے ادبی میں داخل ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کی مراد ادب کے خلاف نہ تھی گو ایہام خلاف کا ہوتا ہے۔

مزاح میں حسب موقع ایہام کی اجازت ہے

سو مزاح میں ایسے ایہام (۲) کی اجازت ہے جبکہ شیخ کی طبیعت مزاح پر مائل ہو یہ نہیں کہ ہر وقت موقعہ بے موقعہ ایسے جملے استعمال کیا کرو۔ سو دیکھئے اہل لطائف کے یہاں مٹھائی میں بھی علمی نکات ہوا کرتے ہیں ان کا کوئی کام اور کوئی قول بھی علمی مضامین سے خالی نہیں ہوتا یہ قصہ تو تبعاً یاد آ گیا تھا اصل مقصود یہ تھا کہ مولانا نے کل جدید لذیذ کے قاعدہ سے اپنے اس فعل کی وجہ بتلائی کہ میں غریبوں کو عمدہ کھانے اور امیروں کو معمولی کھانے کیوں کھلاتا ہوں۔ اس لیے کہ ہر ایک کو جدید کھانوں سے لذت حاصل ہوا کرتی ہے تو جس کے حق میں جو جدید ہو اس کو وہی کھلانا چاہئے۔ اسی بنا پر میرا جی چاہا کہ اس جدید نعمت سے جو فی نفسہ قدیم ہے مگر مجھ پر بہیئت مخصوصہ (۳) وارد ہونے کی وجہ سے مجھے جدید معلوم ہوئی ہے اور اس سے مجھ پر ایسا خاص اثر ہوا ہے جو جدید نعمت سے ہوا کرتا ہے احباب کو بھی مطلع کروں وہ نعمت یہ ہے کہ ایک مرتبہ جا رہا تھا یا بیٹھا ہوا تھا کہ قلب پر خود بخود یہ بات آئی کہ ہم آخرت کی طرف چل رہے ہیں اور جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں اتنا ہی ہم آخرت کی طرف مسافت طے کر رہے ہیں یہاں تک کہ ایک دن موت آجائے گی اور یہ مسافت قطع ہو جائے گی جس کے بعد ہم آخرت تک پہنچ جائیں گے یہ مضمون ایسا ظاہر ہے کہ حدیث وغیرہ سے اس کے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے الدنیا مدبرة والاخرة مقبلة

(۱) ایسا جملہ بولد یا جس کے دو مطلب ہیں (۲) ایسے مبہم ذو معنی جملے بولنے کی اجازت ہے (۳) اس خاص صورت میں پیش آنے کی بنا پر جدید ہے۔

او کماقال (۱) یعنی دنیا جارہی ہے اور آخرت آرہی ہے اس کا وہی حاصل ہے خواہ اس کو یوں تعبیر کیا جائے کہ ہم آخرت کی طرف جارہے ہیں خواہ یوں تعبیر کیا جاوے کہ آخرت ہماری طرف آرہی ہے۔ دوسری تعبیر مجازی ہے پہلی حقیقت جیسا اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کے لیے اقبال ثابت فرمایا ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ واقع میں زمانہ خود حرکت کررہا ہے اور ہماری حرکت فی الزمان مجازی ہے (۲)۔ البتہ مکان میں ہماری حرکت حقیقی ہے چنانچہ ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف ہم خود حرکت کرتے ہیں مکان خود ہماری طرف نہیں آتا۔ بخلاف حرکت فی الزمان کے کہ اس کے اعتبار سے ہم متحرک مجازی ہیں کیونکہ ہم کو ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ کی طرف خود جانا نہیں پڑتا بلکہ زمانہ خود بخود حرکت کرکے آتا ہے چنانچہ ہم سوتے رہتے ہیں اور زمانہ ہمارے اوپر گزرتا رہتا ہے کہ اس سے ظاہر ہوگیا کہ حرکت فی الزمان میں ہمارے قصد و اختیار کو اصلاً دخل نہیں حقیقت میں زمانہ خود متحرک ہے اور ہم متحرک فی الزمان حقیقۃً نہیں۔

حرکت فی الزمان ممکن نہیں

پس زمانیت کے لیے حرکت فی الزمان مجازی ہے اور بنابراس تحقیق کے لطیفہ تفسیر یہ بھی تنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ قرآن میں یہ ہے اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۳) ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جب ان کی میعاد (معلوم یعنی موت) آجائے گی تو اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ موت کے وقت سے نہ کوئی آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے اور مقصود یہ ہے کہ موت کے آنے کے بعد اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اب یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ آیت سے جو مضمون مقصود ہے یعنی موت سے محفوظ نہ ہوسکنا اس سے لا یستاخرون عنه ساعة کا دخل تو ظاہر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ موت کا وقت آنے کے بعد اس سے بچ نہیں سکتے اور بچنے میں تاخر کو دخل ہوسکتا ہے مگر لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ کو اس میں کیا دخل ہے یہ جملہ کیوں بڑھایا گیا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے وقت سے پہلے کوئی

(۱) کنزالعمال: ۶۳۱۱ بلفظ آخر (۲) زمانہ متحرک ہے اور زمانے میں ہماری حرکت مجازی ہے یعنی ہم حرکت کریں نہ کریں زمانہ گزر جائے گا (۳) سورہ یونس: ۴۹

بھی نہیں مرسکتا۔ سو یہ حکم تو صحیح ہے جو مقصود ہے اس میں کیا دخل کیونکہ تقدیم میں نافع ہونے کا کیا احتمال ہے وہ تو اور الٹ مضر ہوگا پھر خصوص مجی اجل (مدت آنے) کے بعد تو عقلاً بھی اس کا احتمال نہیں ہاں تاخیر کا احتمال ہوسکتا تھا اس لیے اس کی نفی بے شک مفید ہے تو یہ جملہ بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں مگر حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عجیب جواب دیا تھا جو میں نے کہیں منقول نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کسی نے لکھا ہو مگر میری نظر سے نہیں گزرا اور نہ مجھ کو اس تلاش کا اہتمام ہے ہمیں تو خدا تعالیٰ نے مشائخ ہی ایسے دیئے تھے جن کی باتوں سے ایسی تسلی ہوجاتی تھی جس سے کتب بینی سے استغناء ہوگیا۔ مولانا نے فرمایا کہ اس اشکال کا مبنی تو یہی ہے کہ تقدیم نافع نہیں ہوسکتی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تقدیم ممکن ہوتی تو وہ بھی نافع ہوسکتی اس طرح موت سے بچنے کی دو صورتیں ہوسکتی تھیں ایک یہ کہ وقت موت سے مقدم وقت میں چلا جائے مثلاً جمعہ کا دن موت کے لیے مقرر ہوا وہ وقت آیا اور یہ شخص جمعرات کے دن میں داخل ہوجائے دوسرے یہ کہ وقت موت سے موخر وقت میں چلا جاوے مثلاً جمعہ کا دن آنے کے بعد موت کے آثار دیکھ کر سنیچر کے دن میں پہنچ جائے تو دونوں صورتوں میں موت نہ آئے گی کیونکہ وقت مقررہ تو جمعہ کا تھا اور جمعہ سے دونوں صورتوں میں فرار ہوگیا تو حق تعالیٰ نے اس طرح اشارہ کردیا ہے کہ دونوں صورتیں نافع ہوسکتی تھیں مگر چونکہ حرکت من الزمان ممکن نہیں اس لیے کسی صورت کا وقوع نہیں ہوتا خیر یہ تو لطائف ہیں جو ضمناً بیان کردیئے ورنہ اصل مقصود آیت کا صرف یہ ہے کہ موت آنے کے بعد اس سے بچنا ناممکن ہے جس کو محاورہ میں اسی طرح تعبیر کیا کرتے ہیں لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ وَلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (جیسے وما یبدئ وما یعید وہی دوسری بار بھی پیدا کرے گا) میں ابداء واعادہ(۱) کے معنی حقیقی مراد نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ باطل کار آمد نہیں ہوتا اس مقصود کو اس عبارت میں محاورہ کے موافق بیان کردیا گیا اسی طرح یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تاخر وتقدم کی حقیقۃً نفی مراد نہیں بلکہ حاصل مراد ہے اور محاورات میں کسی شے سے نہ بچ سکنے کو اسی طرح بیان کیا کرتے ہیں) اس تقدیر پر آیت

(۱) ابتدائی پیدائش اور دوبارہ پیدا کرنے میں۔

کو حرکت زمانی فی الزمان کی بحث سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ یہ محض ایک لطیفہ ہوگا مگر قرآن میں ایسی جامعیت ہے کہ۔

بہار عالم حسنش دل وجان تازہ می دارد برنگ اصحاب صورت را بہ بوار باب معنی را(۱)

قرآن میں لطائف عقلیہ کی بہت گنجائش ہے گو وہ لطائف مسوق لہا الکلام(۲) نہ ہوں اس بناء پر ایسے نکات جو قواعد شرعیہ وعربیہ کے خلاف نہ ہوں قرآن میں بیان کرنے کا مضائقہ نہیں۔ الغرض یہ بات میرے دل پر آئی کہ ہم آخرت کی طرف چل رہے ہیں اور ہر وقت ہر ساعت برابر چل رہے ہیں یا یوں کہہ دیا جائے کہ آخرت برابر ہماری طرف چلی آرہی ہے۔

سلوک میں ہر حال میں ترقی کرنے کی ضرورت

یہی مضمون قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ (۳) اور ایک تفسیر یہ بھی ہے حافظ کے اس شعر کی۔

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محمل ھا(۴)

اس کی ایک تفسیر یہی کی گئی ہے کہ دنیا میں امن وعیش کہاں جبکہ ہر دم دنیا کی حالت یہ پکار کر کہہ رہی ہے کہ اسباب باندھ لو اور چلنے کی تیاری کرو کیونکہ واقعی ہمارا ہر سانس جو گزر رہا ہے وہ اس کی خبر دے رہا ہے کہ تم آخرت کی طرف اتنے نزدیک ہو گئے ہو جس کی عمر بیس سال کی ہے اس نے آخرت کی طرف بیس سال کی مسافت طے کر کے قرب حاصل کر لیا جس کی زیادہ عمر ہے اس نے زیادہ قرب حاصل کر لیا ہے (سچ کہا ہے کسی نے)

یسر المرء ما ذهب الليالی وكان ذهابهن له ذهابًا(۵)

انسان کو اس سے خوشی ہوتی ہے کہ میرے بچہ کی عمر دس سال یا بیس سال کی

(۱) ''اس کے حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل وجان کو اپنے حسن صوری سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو اپنے حسن معنوی سے تر و تازہ رکھتی ہے'' (۲) اگرچہ ان لطائف کو بیان کرنے کے لیے کلام نہ لایا گیا ہو (۳) ''ان لوگوں سے ان کا حساب نزدیک آپہنچا اور یہ غفلت میں ہیں'' سورہ انبیاء: ۱ (۴) ''مجھ کو منزل محبوب میں امن وسکون کہاں ہے جبکہ ہر وقت کوچ کی گھنٹی بجتی ہے کہ سامان سفر باندھو'' (۵) ''ولی خوش ہوتا ہے کہ اتنے ایام گزر گئے حالانکہ دنوں کا گزرنا اس کی عمر کا گزرنا ہے''

ہوگئی اور یہ خبر نہیں کہ وہ اسی قدر موت سے قریب ہوگیا ہے ۱۲ جامع۔ اسی مضمون کو حافظؒ نے اس شعر میں بیان فرمایا ہے اور جرس (۱) کا لفظ اس بنا پر اختیار فرمایا کہ اس زمانہ میں قافلہ کے ساتھ جرس رہنے کی عادت تھی جیسے آج کل اسٹیشن پر گھنٹی بجا کرتی ہے یہ بھی جرس کی یادگار ہے مگر آج کل بدوؤں میں جرس کی جگہ حَیَّ بولنے کا دستور ہے بس ان کو حی کہتے ہیں دوسرے میت ہوجاتے ہیں کیا مجال ہے جو اس آواز کے بعد قافلہ کے چلنے میں ذرا بھی توقف ہوسکے ریل کی سیٹی کے بعد دیر ہوسکتی ہے مگر ان کی حی کے بعد دیر نہیں ہوتی یہ تفسیر تو اس شعر کی اہل زہد نے کی ہے اور عارفین کے نزدیک اس کی اور تفسیر ہے کہ مجھے منزل محبوب میں امن وعیش کہاں کیونکہ یہاں تو ہر وقت جرس کی فریاد ہے کہ اس منزل پر نہ ٹھہرو اسباب باندھ کے آگے چلو آگے چلے تو وہاں بھی قیام نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھنے کی تاکید ہے خلاصہ یہ کہ سلوک میں ترقی کرتے رہو کسی ایک حال پر قناعت نہ کرو ایک مقام پر ٹھہرو نہیں تو جب سالک کو ہر دم ترقی کی فکر ہے تو اس کو امن وعیش کہاں اس مضمون کو دوسرے عارف نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

نگردد وقطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا　　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا (۲)

کہ یہ راستہ دوڑنے سے قطع نہیں ہوسکتا جتنا چلتے ہیں اتنا ہی راستہ نکلتا چلا آتا ہے جیسے پہاڑوں کے بیچ میں راستہ ہوتا ہے کہ دور سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگے دونوں پہاڑ ملے ہوئے ہیں بس اس کے بعد راستہ ختم مگر جوں جوں قریب پہنچتے ہیں راستہ نکلتا آتا ہے، یہی حال طریق سلوک کا ہے کہ اس کا منتہی کسی جگہ نہیں مگر حافظ نے اس مضمون کو مبہم فرمایا ہے جس سے صاف یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ طریق سلوک کے متعلق فرمارہے ہیں اسی لیے لوگ ان کو کبابی شرابی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا کلام مختلف محامل پر محمول ہوسکتا ہے۔ مولانا رومی نے اس کو صاف صاف بیان فرمایا ہے۔

اے برادر بے نہایت در گہیست　　　ہرچہ بروے میرسی بروے مایست (۳)

(۱) گھنٹی (۲) ''عشق کا راستہ دوڑنے سے طے نہیں ہوتا جس طرح درخت انگور جتنا قطع کرو اور بڑھتا ہے''
(۳) ''بھائی محبوب کی درگاہ کی انتہاء نہیں ہے جس مقام پر پہنچو مت ٹھہرو آگے چلو''

اہل جنت کے احوال

اور دنیا میں تو سلوک کی انتہا ہے ہی نہیں بعض عارفین کا ارشاد ہے کہ آخرت میں بھی ترقی بند نہ ہوگی بلکہ وہاں بھی ہر دم ترقی ہوتی رہے گی کیا عجب ہے کہ خلود اسی واسطے ہو کیونکہ جب راستہ بے نہایت ہے تو اس کے طے کرنے کے لیے سالک کو بھی عمر بے نہایت تک زندہ رہنا چاہئے اور جب آخرت میں بھی ترقی بند نہ ہوگی تو ممکن ہے کہ جس طرح بعض لوگ وہاں پر جنت وحور میں مشغول ہوں گے بعض ان سے بڑھ کر ہوں جو محض دیدار الٰہی میں مشغول ہوں اور ان کو تجلیات میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی رہتی ہو۔ اسی لیے بعض کا قول ہے ان فی الجنان جنة لیس فیھا حور ولا قصور ولکن ارنی ارنی یعنی جنتوں میں ایک جنت ایسی بھی ہے کہ جہاں نہ حور ہے نہ قصور بلکہ صرف تمنائے دیدار ہوگی اور وہاں کے رہنے والے ہر وقت یہی پکاریں گے ارنی ارنی (مجھ کو دیدار دکھایئے مجھ کو دیدار دکھایئے) مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو لوگ حور وقصور میں ہوں گے وہ علی الاطلاق ان سے کم درجہ والے ہوں گے۔ مجموعہ تین قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جن کو حور وقصور ہی کا مشاہدہ ہے اور ان کو اس میں جمال حق نظر نہیں آتا اور خاص خاص مدت میں تجلی حق سے مشرف ہوتے ہیں دوسرے وہ جو صرف جمال حق کے مشاہدہ میں مستغرق ہیں(۱) ان کو کسی طرف التفات نہیں(۲)، تیسرے وہ جو جمال حق کے مشاہدہ میں مستغرق رہ کر اس درجہ پر پہنچ گئے کہ ہر چیز میں ان کو جمال حق کا ہی مشاہدہ ہوتا ہے(۳) اور ظاہر میں حور وقصور سے بھی متمتع ہو رہے ہیں(۴) تو یہ ارنی والے پہلے درجہ والے سے تو بڑھے ہوئے ہوں گے مگر تیسرے طبقہ سے افضل نہ ہوں گے بلکہ تیسرا طبقہ ان سے بھی بڑھا ہوا ہے اور اس مذاق کے لوگ دنیا میں بھی نظر سے گزرے ہیں جن کو جمال حق کے سامنے حور وقصور کی پروا نہ تھی(۵)۔ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی فرماتے تھے کہ جب ہم جنت میں جائیں گے اور حوریں آویں گی" یہ بات

(۱) اللہ تعالیٰ کی تجلی کے مشاہدے میں ڈوبے ہوئے ہیں (۲) کسی اور طرف توجہ نہیں (۳) مشاہدہ جمال حق میں اس درجہ ڈوب گئے کہ ہر چیز میں حق تعالیٰ کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں (۴) ظاہری طور پر حوروں سے بھی نفع اٹھا رہے ہیں (۵) اللہ کے حسن وجمال کے مقابلے میں کسی کی پروا نہیں۔

اس طرح فرمائی گویا یہ طے شدہ بات ہے کہ جنت میں تو ضرور ہی جائیں گے یہ غلبہ رجا تھا(۱)، تو ہم حوروں سے کہیں گے کہ بی قرآن پڑھو تو یہاں بیٹھو ورنہ چلتی بنو۔ مگر اس وقت مولانا پر غلبہ حال تھا عشق کا حال غالب تھا کبھی عارف پر عشق کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے اور جب معرفت کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت اس کو کوئی چیز مشاہدہ حق سے مانع نہیں ہوتی جملہ اشیاء مرآۃ جمال محبوب بن جاتی ہیں (۲) اس وقت وہ یوں کہتا ہے۔

ماچو چنگیم و تو زخمہ می زنی زاری ازمانہ تو زاری می کنی (۳)

حضرت اکابر صوفیاء کی عمدہ لباس اور عمدہ غذا میں نیت

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرات اکابر صوفیہ جیسے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس سرہ عمدہ لباس اور عمدہ غذائیں اس لیے استعمال کرتے تھے کہ ان کو ان چیزوں میں نعمائے جنت کے اظلال (۴) نظر آتے تھے تو عارف کو بعض دفعہ ہر چیز میں ظل جمال (۵) حق نظر آتا ہے اس وقت یہ حال ہوتا ہے کہ وہ حور کو بھی حاجب (۶) نہیں سمجھتا بلکہ وہ اس کے لیے ایسی بن جاتی ہے جیسے آئینہ میں صورت محبوب نظر آیا کرتی ہے اور جس وقت معرفت کا غلبہ نہ ہو بلکہ عشق کا غلبہ ہو تو وہ اس سے زیادہ کہتا ہے یعنی اپنے کو بھی حجاب سمجھتا ہے حور کو تو کیوں نہ سمجھے گا حضرت قلندرؒ فرماتے ہیں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم
گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرو تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن نہ دہم (۷)

اور عارف اپنے کو بھی مرآۃ (۸) سمجھتا ہے اور یوں کہتا ہے۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیرسر درسمن آ
تو زغنچہ نہ دمیدہ دردل کشا بچمن در آ (۹)

---

(۱) امید غالب تھی (۲) ہر چیز محبوب کے جلوہ کے لیے مثل آئینہ ہوجاتی ہے (۳) ''ہم مثل چنگ کے ہیں اور آپ مضراب مارتے ہیں گریہ وزاری ہماری طرف سے ہے نہ آپ زاری کرتے ہیں'' (۴) جنت کی نعمتوں کا پرتو نظر آتا تھا (۵) جمال حق کا سایہ (۶) مانع (۷) ''مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں اگر ملک الموت میری جان لینے کو آئے تو میں جب تک آپ کی تجلی نہ دیکھ لوں جان نہ دوں گا'' (۸) اپنی ذات کو بھی مثل آئینہ سمجھتا ہے (۹) ''تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو''

چنانچہ صوفیہ نے قلب میں تمام عالم ناسوت وملکوت کو مندرج مانا ہے(۱)اس لیے وہ کہتے ہیں کہ تم کو چمن اور سرو وسمن (۲) کی سیر کی ضرورت نہیں اپنے دل کا دروازہ کھول کر اس کی سیر کرو اس میں سب کچھ موجود ہے اور دوسرے آثار کو بھی جیسا مولانا نے ایک صوفی کا قصہ لکھا ہے۔

صوفی درباغ از بہر گشاد صوفیانہ روئے بر زانو نہاد

یعنی وہ سر جھکائے باغ میں مراقب بیٹھا تھا کسی نے کہا فَانْظُرْ اِلٰی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہ (آثار رحمت الٰہی کی طرف دیکھو)۔

آثار رحمت کا مشاہدہ امر

صوفی نے جواب دیا کہ میں تو آثار رحمت ہی کا مشاہدہ کر رہا ہوں اور تم آثار الآثار کو دیکھ رہے ہو(۳)۔اس صوفی نے تفسیر میں تغیر نہیں کیا بلکہ استدلال کیا ہے کہ جب ان آثار رحمت کے مشاہدہ کا امر ہے جو ظل آثار رحمت ہیں تو اصل آثار کے مشاہدہ کا امر کیوں نہ ہوگا جو مومن کے قلب میں ہیں تو مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب کو غلبہ عشق میں یہ یاد نہ رہا کہ وہاں حور بھی حجاب نہ ہوگی یعنی مشاہدہ جمال حق سے مانع نہ ہوگی (۴) اس لیے یہ فرمایا کہ حوریں آئیں گی تو ہم ان سے کہیں گے کہ بی قرآن سناؤ تو بیٹھو ورنہ چلی جاؤ۔ ورنہ وہاں حوروں سے باتیں کرنے میں بھی وہی قرب ہوگا جو تلاوت قرآن میں حاصل ہوتا ہے۔تو غالباً وہ جنت میں ارنی ارنی کی صدا ہوگی (۵) وہاں ایسے ہی عشاق کا مجمع ہوگا عارفین کاملین ان سے بھی اوپر کے درجہ میں ہوں گے جہاں حور وقصور سب کچھ ہوں گے اور کوئی چیز مانع مشاہدہ حق سے نہ ہوگی مگر جنت میں کسی ایسی جنت کا ہونا صرف اس صوفی کے قول سے معلوم ہورہا ہے احادیث سے اس کا کہیں ثبوت نہیں ملا پس یا تو اس کو کشف پر محمول کر کے سکوت (۶) کیا جائے یا تاویل کر کے احادیث پر منطبق کرلیا جائے تاویل یہ کہ صوفی کا

(۱)فرشتوں اور انسانوں کی دنیا کو دل میں داخل مانا ہے (۲) باغ میں جا کر سیر کرنے کی ضرورت نہیں (۳)میں تو آثار رحمت ہی کے مشاہدے میں مشغول ہوں البتہ ثم آثار کی علامات کے مشاہدہ میں مشغول ہو (۴)خوبصورت حوروں کو دیکھنا حق تعالیٰ کے جمال کے مشاہدے کے لیے رکاوٹ نہیں ہوگا (۵)اپنا دیدار کرادیجئے کی صدائیں بلند ہوں گی (۶)خاموشی اختیار کی جائے۔

مطلب یہ نہیں کہ ایسی جنت کوئی مستقل ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی حوروں قصور والی جنت میں ایک حالت ایسی ہوگی جس میں غیر کی اصلا گنجائش نہ ہوگی بلکہ اس وقت مشاہدہ جمال حق میں بجزارنی کے (۱) اور کوئی تمنا نہ ہوگی نہ کسی کی طرف التفات ہوگا چنانچہ یہ مضمون دو حدیثوں کے مجموعہ میں ہے ایک یہ کہ جب اہل جنت جنت میں پہنچ جائیں گے تو حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے جنت والو تم اور کچھ چاہتے ہو وہ کہیں گے خداوند آپ نے ہم کو بہت کچھ عطا فرمادیا ہے ارشاد ہوگا کہ لو ہم تم کو اس سے بھی افضل نعمت عطا کرتے ہیں اور اس کے بعد حق تعالیٰ تجلی فرمائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس نعمت سے زیادہ لذیذ اہل جنت کے نزدیک کوئی نعمت نہ ہوگی رواہ مسلم اور جب تک اس تجلی میں مشغول رہیں گے۔ کسی نعمت کی طرف التفات نہ کریں گے رواہ ابن ماجہ۔ ان حدیثوں سے اس صوفی کے قول کی مناسب تاویل ہوسکتی ہے پس اس بناء پر جنت میں بھی ترقی مظنون ہوئی (۲) تو بعض نے ترقی مسلوک (۳) کو اس شعر حافظ کا محمل ٹھہرایا ہے اور بعض نے دنیا سے آخرت کی طرف سفر کرنے کو محمل کہا ہے اور میں اسی کو کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ آخرت کی طرف چل رہے ہیں ہم کو ہر وقت یہ مراقبہ پیش نظر رکھنا چاہئے اور جس طرح سفر قطع کرنے میں ہر وقت اس پر نظر رہتی ہے کہ کون امر اس سفر میں معین ہے تو اس کی تحصیل کرتا ہے اور کون امر مانع ہے اس سے دور رہتا ہے اسی طرح اس سفر الی الآخرت میں بھی ہر دم ہر کام کے وقت یہ سوچ لیا کریں کہ یہ آخرت کی منزل میں مفید ہوگا یا مضر (۴) اب بعض امور تو معین آخرت ہوں گے جیسے ذکر اللہ، امر بالمعروف تلاوت قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہا یہ تو معین ہیں مقصود میں یعنی حصول نجات میں اور یہی منزل پر پہنچنا اور بعض امور مانع عن الوصول ہیں (۵) جیسے معاصی ظاہرہ و باطنہ اور بعض امور ظاہر میں نہ معین ہیں نہ مانع جیسے امور مباحہ (۶) کہ ان کے کرنے میں ثواب نہیں الا بنیة مخصوصة (مگر نیت مخصوصہ سے) اور ترک میں گناہ نہیں اس کو عام لوگ مستقل قسم ثالث سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں اثر کے اعتبار سے یہ تیسری قسم نہیں بلکہ ان دونوں قسموں میں سے کسی ایک قسم کی طرف راجع ہے کیونکہ مباح بھی اثر محدود

(۱) سوائے اس بات کے کوئی تمنا نہیں ہوگی کہ مجھے اپنا دیدار کرادیجئے (۲) اس ترقی کا گمان ہے (۳) ترقی سلوک کو (۴) نقصان دہ (۵) منزل تک پہنچنے میں باعث رکاوٹ ہیں (۶) جائز کام۔

واثر مذموم سے خالی نہیں ہوتا فعل مباح کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے یا محمود یا مذموم (۱) گو وہ اپنی ذات کے اعتبار سے نہ محمود ہے نہ مذموم مگر ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا اثر بھی غیر محمود غیر مذموم ہی ہے (۲) بلکہ اثر یا محمود ہوتا ہے یا مذموم۔ پس اگر اس کا اثر محمود ہے تو وہ قسم اول اعمال مفید آخرت میں داخل ہے (۳) اور اگر اثر مذموم ہے تو قسم دوم مضرت آخرت میں داخل ہے۔ اس تقریر کے بعد ایک حدیث کا اشکال رفع ہوگیا۔ حدیث یہ ہے من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه (۴) اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ لایعنی سے امور محرمہ تو مراد ہو نہیں سکتے کیونکہ ان کا ترک تو واجب و لازم ہے اور سیاق حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وجوب ترک مراد نہیں بلکہ محض ترغیب ترک دی جارہی ہے تو یقیناً لایعنی سے مراد امور مباحہ ہیں تو اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ امور لایعنی مانع عن الوصول اور مضر آخرت نہیں ہیں تو ان کے ترک کی ضرورت کیا ہے تقریر گزشتہ سے معلوم ہوگیا کہ امور مباحہ کو لایعنی (۵) کہنا یہ محض درجہ ذات کے اعتبار سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی درجہ کے اعتبار سے ان پر لایعنی کا اطلاق فرمایا ہے ورنہ آثار کے اعتبار سے یہ امور مایضر ہیں (۶) یعنی مضر اور اسی درجہ آثار کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ترک کا امر فرمارہے ہیں اور اس کو کمال اسلام کی خوبی بتلارہے ہیں پس اگر کوئی مباح مفید آخرت ہو تو اس وقت وہ لایعنی نہ ہوگا۔

مزاح کا اصل مقصد

مثلاً مزاح (۷) کرنا بچوں سے یا دوستوں سے یہ فی نفسہ مباح ہے جس سے نہ ثواب نہ گناہ مگر اثر کے اعتبار سے یا مفید آخرت ہے یا مضر اگر مفید ہوا تو لایعنی نہ رہے گا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مزاح فرمایا ہے حالانکہ یقیناً آپ امور لایعنی سے بری تھے اس کا معیار یہ ہے کہ اپنی نیت کو دیکھو کہ مزاح سے مقصود کیا ہے۔ ہمارے یہاں تو کچھ بھی مقصود نہیں ہوتا ہم لوگ اکثر کام بدون کسی خاص ارادہ اور نیت کے کرتے ہیں محض عادت کی بنا پر اکثر کام ہوتے ہیں اور اگر کسی مقصود کا ارادہ بھی ہوتا ہے تو وہ نفس کی کوئی

(۱) اچھا یا برا (۲) اس کا اثر نہ اچھا ہو نہ برا ایسا نہیں ہوتا (۴) وہ ان اعمال میں داخل ہے جو آخرت کے لیے مفید ہیں (۴) ''مسلمان کے اسلام کی خوبی میں سے یہ بات ہے کہ وہ لایعنی اور فضول کاموں کو ترک کردے ۱۲'' کنز العمال: ۳/۸۲۹۱ (۵) بیکار کہنا (۶) نقصان کا باعث ہیں (۷) خوش طبعی۔

غرض ہوتی ہے بلکہ ہم کیا کہیں ہماری تو نماز بھی نفس ہی کے لیے ہے اس میں بھی کوئی نیت خالص آخرت کے لیے نہیں ہوتی اسی لیے نماز پڑھ کر ہمیں تو ڈر لگتا ہے کہ یہ کس منہ سے کہیں کہ اے اللہ قبول فرمالے بلکہ یوں دعا کرتے ہیں کہ خدا معاف کرے تو ہمارے یہاں مزاح میں تو کیا نیت ہوتی امور واجبہ ومفروضہ (۱) میں بھی کوئی خاص نیت نہیں ہوتی بلکہ اکثر افعال عادت کی وجہ سے خود بخود صادر ہوجاتے ہیں اور اگر کوئی نیت ہوتی بھی ہے تو وہ نفس کی غرض سے خالی نہیں ہوتی خیر یہ تو ہمارا حال ہے اس کو تو رہنے دیا جائے۔ حضور ﷺ کے مزاح میں تو یقینا کچھ مصالح ضرور ہوں گے۔ حضور ﷺ کے مزاح میں تو مصالح کیوں نہ ہوتیں عارفین نے بھی عجیب عجیب مصالح مزاح میں اختیار کی ہیں۔ حضور ﷺ کے مزاح میں علاوہ اور مصالح کے ایک ادنیٰ مصلحت کم از کم یہ تو ضرور ہے کہ حضور ﷺ کا مقصود تبلیغ واصلاح ہے جس میں ایک کام تو آپ کا تھا پہنچا دینا اور ایک کام قابل کا ہے کہ وہ فیض لے (۲) جس کے لیے حضور ﷺ کی خداداد ہیبت کس قدر مانع ہوسکتی تھی (۳) کیونکہ حضور ﷺ کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی جس کی وجہ سے بڑے بڑے سلاطین دور دراز کی مسافت پر آپ کے رعب سے کانپتے تھے اور جو آپ کے سامنے آتا تھا اس کو از خود گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی اور فیض لینے کے لیے مستفید (۴) کے دل کھلنے کی ضرورت ہے جب تک اس کا دل نہ کھل جائے اس وقت تک وہ فیض نہیں لے سکتا بس یہ حال ہوجاتا ہے۔

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجاتا ہے تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے

عاشق پر جب محبوب کی ہیبت کا غلبہ ہوتا ہے تو جو کچھ وہ سوچ کر آتا ہے کہ یوں کہوں گا یہ پوچھوں گا صورت دیکھتے ہی سب ذہن سے نکل جاتا ہے اور وقت پر کچھ بھی نہیں کہا جاتا ہمارے ایک عزیز ناخواندہ کہتے ہیں۔

یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آجاتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس لیے حضور ﷺ صحابہ سے گاہے مزاح فرمایا کرتے تھے (۵) تاکہ ان کا

(۱) فرض وواجب کام (۲) آپ ﷺ کے فیض کو حاصل کرے (۳) آپ کا رعب رکاوٹ بن سکتا تھا (۴) استفادہ کرنے والا (۵) کبھی کبھی مذاق کرلیتے تھے۔

دل کھل جائے اور بے تکلف ہو کر استفادہ کر سکیں اور حضور ﷺ کی ہیبت تو بھلا کیسی کچھ ہو گی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دبدبہ

جب حضور ﷺ کے غلامان غلام کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک جماعت کے ساتھ چلے جا رہے تھے کہ دفعۃً آپ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سب مارے ہیبت کے گھٹنوں کے بل گر پڑے حالانکہ یہ وہ حضرات تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مرید نہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ پیر بھائی تھے جن میں گو نہ مساوات ہوا کرتی ہے مگر ان پر بھی آپ کا اس قدر رعب تھا مگر شاید اس میں کوئی یہ شبہ نکالے کہ وہ حضرات معتقد تو تھے تو سنئے کہ غیر معتقدین پر آپ کے رعب کی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ سفیر روم بڑی شان وشوکت کے ساتھ مدینہ منورہ میں آپ کی خدمت میں آیا اور شہر میں داخل ہو کر لوگوں سے دریافت کیا کہ خلیفہ کا قصر کہاں ہے۔

گفت کو قصر خلیفہ اے حشم تامن اسپ درخت را آنجا کشم
قوم گفتندش کہ اورا قصر نیست مرعمر را قصر جان روشنے ست(۱)

(اس موقع پر حضرت مولانا پر گریہ طاری ہو گیا مگر بہت ضبط سے کام لیا ۱۲)۔

لوگوں نے کہا کہ عمر کے لیے نہ قصر ہے نہ ایوان ہے بس ان کا تو دل ہی قصر وایوان ہے۔ قاصد کو بڑے حیرت ہوئی کہ وہ خلیفہ جس کے نام سے سلاطین کانپتے ہیں اس کے نہ محل نہ قصر یہ کیا معاملہ ہے پھر اس نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں بیٹھا کرتے ہیں لوگوں نے کہا مسجد میں اکثر بیٹھا کرتے ہیں اور کبھی بازاروں میں گلی کوچوں میں اور کبھی جنگل میدانوں میں گھومتے پھرتے ہیں تلاش کر لو کہیں مل جائیں گے۔ اب وہ آپ کی تلاش میں چلا معلوم ہوا کہ ابھی جنگل کی طرف تشریف لے گئے ہیں سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ عجیب بادشاہ ہے جو تنہا بازاروں جنگلوں میں پھرتا ہے، نہ ساتھ میں پہرہ دار ہیں نہ پولیس آخر وہ جنگل کی طرف چلا جس وقت اس باغ کی حد میں قدم رکھا جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پڑے سو رہے تھے قدم رکھتے ہی اس کے دل پر ہیبت ورعب نے غلبہ کیا کیونکہ جنگل

(۱) ”کہنے لگا اے لوگو! خلیفہ کا محل کہاں ہے تا کہ میں وہاں حاضر ہوں لوگوں نے کہا کہ ان کا کوئی محل ظاہری نہیں ہے ان کا محل ان کا قلب روشن ہے“

میں ایک خدا کا شیر پڑا ہوا تھا اور قاعدہ ہے کہ جہاں شیر پڑا ہوتا ہے اس جنگل میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اب اس سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پاس نہ کوئی پہرہ چوکی ہے نہ جاہ حشم ہے نہ ساز وسامان ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی میرا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک خدا کا شیر جنگل میں تن تنہا پڑا سو رہا ہے نہ اسے کسی دشمن کا خوف ہے نہ جاسوس کا ڈر، سر کے نیچے ایک اینٹ تکیہ کے بجائے رکھی ہے نہ کوئی فرش ہے نہ بستر بس گلے میں ایک تلوار پڑی ہوئی ہے اور بے فکر سو رہے ہیں۔ اس حالت کا مقتضا یہ تھا کہ سفیر کے دل میں خلیفہ کی بے وقعتی ہوتی مگر یہاں برعکس معاملہ یہ ہوا کہ صورت دیکھتے ہی سفیر روم لرزنے لگا جونہی نظر پڑی ہے پیر اٹھانے کی ہمت نہ رہی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت وہ سفیر اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ میں نے تو بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں جن کے دربار میں رعب وداب کے ہزار سامان ہوتے تھے مگر مجھ پر کسی کا رعب طاری نہ ہوا آج کیا بات ہے کہ اس بے سروسامان شخص کے رعب سے میرا پتہ پانی ہوا جاتا ہے آخر اس شخص کے اندر کیا چیز ہے کہ میری رگ رگ میں اس کے دیکھنے سے لرزہ پیدا ہوگیا بیشک۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست (۱)

یہ خدائی رعب وجلال تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ سے ظاہر ہورہا تھا۔ بالآخر سفیر روم کو ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمرؓ کو خود جگائے وہ تو اپنی جگہ دیر تک کھڑا کانپتا رہا کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ایک پردیسی اجنبی آدمی کھڑا کانپ رہا ہے آپ نے اس کو پاس بلایا اور تسلی دی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دبدبہ وہیبت

جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو سفیروں کو مرعوب دیکھ کر فرمایا تھا کہ تم مجھ سے اتنا کیوں ڈرتے ہو میں تو اس غریب عورت کا بچہ ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ کی باتیں سننے کے بعد ہیبت مبدل بہ محبت ہوگئی اور سفیر کو آگے بڑھنے اور

(۱) ''یہ ہیبت حقیقت میں حق تعالیٰ کی ہوتی ہے اس مخلوق یا اس گدڑی والے کی نہیں ہوتی''

بات چیت کرنے کی ہمت ہوئی جس کے بعد وہ سمجھ گیا کہ واقعی مذہب اسلام حق ہے۔ پھر وہ اسلام سے مشرف ہوگیا یہ تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت تھی ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کی ان سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ کا رعب ودبدبہ

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے رعب وہیبت کی یہ شان تھی کہ بڑے بڑے نواب مولانا سے بے تکلف باتیں نہ کرسکتے تھے، حضرت کا ان پر ایسا رعب پڑتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے رکتے اور جھجکتے تھے اور ڈرتے تھے۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن قدس سرہ کی تیزی

اور خیر بعض بزرگوں سے تو لوگ اس لیے ڈرتے ہیں کہ وہ غصیارے ہوتے ہیں بات بات میں ان کو غصہ آجاتا ہے اس لیے ان کے پاس جاتے ہوئے لوگ کانپتے ہیں جیسے مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب تھے یا آج کل بھی ایک بدنام ہے

ہائے ہزار نام فدائے تو بدنامی تو(۱)

مگر مولانا گنگوہیؒ میں تو غصہ کا نام بھی نہ تھا میں نے تو کبھی بھی مولانا کو غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا مگر اس پر بھی مولانا کا اتنا رعب محض ہیبت حق کا اثر تھا اور یہ ہیبت بعض اوقات طالبین کے لیے مانع فیض ہوجاتی ہے(۲) اس لیے حضرات انبیاء علیہم السلام واولیاء کرام اپنے اصحاب واحباب سے گاہے مزاح کرلیتے ہیں تاکہ ان کا دل کھل جائے اور ہیبت ومحبت کے مل جانے سے اعتدال پیدا ہوجائے اسی لیے اہل آداب نے لکھا ہے کہ مہمان کے سامنے اپنے ملازمین پر بھی غصہ نہ ہو کیونکہ اس سے مہمان کو وحشت ہوگی اور وہ گھبرائے گا کہ نہ معلوم اس شخص کا میرے ساتھ کیسا معاملہ ہو اور شاید اس وحشت کی وجہ سے وہ کھانا بھی کم کھائے کہ نہ معلوم یہ کیسے مزاج کے ہوں گے ان کو زیادہ کھانا کہیں

(۱) تجھ پر اور تیری بدنامی پر ہزار نام فدا ہیں ۱۲ جامع (۲) ان کے فیض سے مستفیض ہونے سے رکاوٹ کا باعث ہوتی ہے۔

ناگوار نہ ہو۔ واقعی یہ ہیں آداب اور ہم نے تو اخلاق کا محض نام سن لیا ہے مگر بھائی کیا کریں کھٹے ہیں یا میٹھے سب اسی باغ کے پودے ہیں جب کوئی باغ لگاتا ہے تو سارے درخت میٹھے ہی نہیں پیدا ہوتے بلکہ کوئی میٹھا ہوتا ہے کوئی کھٹا اور اس میں بھی حکمت ہے وہ یہ کہ سب میٹھے ہی پھل ہوں تو ان کے کھانے سے تخمہ اور ہیضہ (۱) کا اندیشہ ہوتا ہے جب میٹھے پھلوں کے ساتھ کوئی کھٹا بھی مل جائے تو سب ہضم ہوتے ہیں اسی لیے اکثر لوگ دیسی آموں کو پسند کرتے ہیں کہ ان میں کھٹے میٹھے ملے ہوئے ہوتے ہیں تو یہ ساتھ ہضم ہوتے رہتے ہیں اور مالدہ آم سب میٹھے ہوتے ہیں ان کو زیادہ کھالو تو ہیضہ ہوجائے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے باطنی باغ میں بھی کوئی درخت میٹھا رکھا ہے کوئی کھٹا۔ باقی ہیں سب اسی باغ کے درخت اس لیے اعتراض کی کوئی وجہ نہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب حالانکہ بہت بڑے ولی وعارف تھے مگر فطرتی طور پر تیز مزاج تھے ان کی تیزی تکبر یا بناوٹ سے نہ تھی بلکہ طبعی تھی اور مشاہدہ سے یہ بات خود معلوم ہوجاتی ہے کہ کس میں طبعی تیزی ہے اور کون تکبر کی وجہ سے تیزی کرتا ہے چنانچہ شاہ صاحب کے یہاں ایک مرتبہ ایک شخص آیا اس نے مسجد میں آکر اپنا سامان رکھا۔ مولانا نے دیکھتے ہی فرمایا ارے نکالو وہ تھا کوئی دلیر۔ کہنے لگا دیکھو تو وہ کون جو مجھے نکالے گا۔ اب کسی خادم کی ہمت نہ ہوئی جو اسے نکالے اور مولانا بار بار فرمارہے ہیں کہ ارے نکالو اس کو مگر کوئی نہ اٹھا آخر کو مولانا خود اٹھے اور اسکا سامان اٹھا کر مسجد سے باہر پھینک دیا اس نے اتنا ادب کیا کہ مولانا کو اسباب اٹھاتے ہوئے کچھ نہیں کہا جب وہ اسباب لے کر چلے خود بھی ساتھ ہولیا جب مولانا نے اسباب کو مسجد سے باہر رکھا اس نے اٹھا کر پھر مسجد میں اپنی جگہ لا رکھا۔ مولانا کو پھر غصہ آیا اور دوسری مرتبہ آپ نے پھر اسباب اٹھا کر مسجد میں اپنی جگہ لا رکھا۔ مولانا کو پھر غصہ آیا اور دوسری مرتبہ آپ نے پھر اسباب اٹھا کر مسجد سے باہر پھینک دیا۔ مسافر نے اٹھا کر پھر اندر رکھ لیا چند مرتبہ ایسا ہی ہوا آخر کار مولانا تھک گئے تو اپنی جگہ پر آبیٹھے اور وہ مسافر اپنی جگہ جما ہوا بیٹھا رہا۔ ان حضرات کے غصہ کی اداہی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا منشا تکبر نہیں اگر مولانا کے غصہ کا منشا تکبر ہوتا تو خود اٹھ کر اس کا اسباب لاد کر باہر نہ نکالتے

(۱) بدہضمی اور ہیضہ جیسی بیماری جس میں الٹیاں آتی ہیں کا ڈر ہے۔

متکبرین ایسا کبھی نہیں کرسکتے وہ جو کچھ کرتے ہیں خدام کے واسطے سے کرتے ہیں خود ایسا کام کبھی نہیں کرتے مگر مولانا نے اس کی پروا بھی نہ کی جب کوئی خادم نہ اٹھا تو خود اسے نکالنے چلے یہ تو ہولیا۔ اور لیجئے کھانے کا وقت آیا تو مولانا نے اس مسافر کے لیے گھر سے کھانا بھجوایا اب اس نے نخرے شروع کئے کہ جاؤ میں نہیں کھاتا یہ روٹیوں ہی کی وجہ سے مسافروں کو دھکے دیئے جاتے ہیں کیونکہ گھر سے کھلانا پڑتا ہے تو میں ایسی روٹیوں سے باز آیا خادم نے جاکر اطلاع کی کہ حضرت مہمان نے کھانا نہیں کھایا اور یوں یوں کہتا ہے کوئی متکبر ہوتا تو یہ جواب سن کر خاموش بیٹھ جاتا مگر مولانا کی طبیعت نے مسافروں کا بھوکا رہنا گوارا نہ کیا خود کھانا لے کر آئے اور اس کی خوشامد کی کہ بھائی تو میرے کہنے کا برا نہ مان، میرے یہاں اکثر لوگ دنیا کے قصے لاتے ہیں کوئی مقدمہ کی باتیں لاتا ہے کوئی اولاد کے لیے دعا کراتا ہے دین کے طالب کم آتے ہیں اس لیے مجھے غصہ آجاتا ہے غرض اس کو کھانا کھلایا مگر یاد رہے کہ یہ معاملہ لطف کا ان لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو صرف مہمان بن کر آئیں کہ ان کی خوشامد کرکے کھانا کھلایا جاتا ہے اور جو شخص مہمان بن کر نہ آئے بلکہ اپنی اصلاح کے لیے آئے اس کا یہ حق نہیں کہ شیخ اس کی خوشامد کرکے کھانا کھلائے بلکہ اس کے ذمہ ہے کہ اپنے کھانے کا خود انتظام کرے وہ اگر نخرے کرے گا تو دماغ کی اصلاح کی جائے گی اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص تو تحصیلدار کے گھر مہمان ہوکر جائے اس کو تو تحصیلدار خاطر مدارات کے ساتھ کھانا کھلائے گا اور ایک شخص تحصیلدار کے یہاں مقدمہ لے کر جائے اس کا یہ حق نہیں ہے کہ تحصیل دار سے کھانا کھائے بلکہ اس کے ساتھ ضابطہ کا برتاؤ ہوگا اسے اپنے کھانے کا خود انتظام کرنا پڑے گا اور اوقات مخصوصہ پر عدالت کے اندر گفتگو کا موقع ملے گا ہر وقت بات چیت کرنے کی بھی اسے اجازت نہ ہوگی نہ اس کے ساتھ حاکم مزاح ودل لگی کرے گا کیونکہ وہ مہمان نہیں ہے بلکہ صاحب غرض ہے آج کل یہ بھی ایک وجہ ہے بزرگوں کو بدنام کرنے کی کہ وہ مہمان اور طالب سب کے ساتھ یکساں برتاؤ چاہتے ہیں حالانکہ مہمان کا اور حق ہے طالب کا اور حق ہے۔ مہمان تو اگر فاسق بھی ہو بلکہ کافر بھی ہو تب بھی اس کے ساتھ خاطر مدارات کا معاملہ کیا جائے گا اور طالب کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہوگا کیونکہ

طالب سے مہمانوں کی طرح معاملہ کرنے سے اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔

بزرگوں کے مزاح میں حکمت

غرض بزرگوں نے جو گاہے اپنے متعلقین سے مزاح کیا ہے اس کی حکمت یہ تھی کہ اس سے طالب کا دل کھل جاتا ہے تو وہ استفادہ بخوبی کرسکتا ہے مگر یہ حکمت ان بزرگوں کے مزاح میں ہے جن کے ذمہ تبلیغ واصلاح کا کام ہے اور بعضے ایسے بھی ہیں جو آزادطبع ہیں وہ تبلیغ وارشاد سے گھبراتے ہیں ان کا مذاق یہ ہوتا ہے۔

احمد تو عاشقی مشیخت ترا چہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد (۱)

وہ حضرات اس قاعدہ کے پابند نہیں ان کے مزاح میں ایک دوسری حکمت ہوتی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ وہ اپنی وضع کو خاک میں ملانا چاہتے ہیں اس لیے مزاح ودل لگی کرتے رہتے ہیں تاکہ چھچھورا پن ظاہر ہو ان کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی ہم کو چھچھورا سمجھ کر چھوڑ دے گا معتقد نہ رہے گا ان کا مذاق یہ ہوتا ہے۔

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار کار ملک است آنکہ تدبیر وتأمل بایدش (۲)

مگر یہ رندوضع سوز ہوتے ہیں شرع (۳) سوز نہیں ہوتے وضع وناموس کو جلا پھونک دیتے ہیں مگر شریعت کے پابند ہوتے ہیں اور جو وضع سوز ہونے کے ساتھ شرع سوز بھی ہو وہ یا تو فاسق ہے (۴) یا مجذوب ہے ان دونوں کے مزاح کی حکمت بیان کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں فاسق تو ولی ہی نہیں اور مجذوب گو ولی ہوتا ہے مگر اس کے افعال میں حکمت کا قصد نہیں ہوتا گو واقع میں حکمت ہوا کرے۔ سو ان دونوں سے یہاں بحث نہیں یہاں گفتگو ان بزرگوں کے مزاح میں ہے جو اپنے افعال میں حکمت کا قصد کرتے ہیں تو ان میں جو آزاد ہوتے ہیں میں نے ان کو مزاح کی حکمت بتلادی کہ وہ اپنی وضع کو جلانے کے لیے اور ناموس کو خاک میں ملانے کے لیے مزاح کیا کرتے ہیں وہ ان مصالح پر نظر نہیں کیا کرتے جن پر اہل سلسلہ کو نظر ہوتی ہے کار ملک است الخ

(۱) ''احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام عاشق رہے سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو'' (۲) ''رند عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل اور تدبیر کرنی چاہئے'' (۳) وضع قطع کو ترک کرتے ہیں شریعت کو نہیں (۴) وضع کا خیال نہ رکھے اور شریعت کا خیال بھی نہ رکھے ایسا شخص فاسق ہے یا مجذوب۔

میں اہل سلسلہ ہی مراد ہیں کہ وہ انتظام سلطنت کرتے ہیں ان کو مصالح کی رعایت کرنی پڑتی ہے سو وہ کریں رند کو اس کی ضرورت نہیں وہ تو ہر وقت اپنے مٹانے کی کوشش کرتا ہے اور بعض دفعہ یہ صفت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ یوں کہنے لگتا ہے۔

پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموختن افروختن وسوختن وجامہ دریدن(۱)

اور یوں کہتا ہے۔

جوش عشق است کاندر مے فتاد آتش عشق است کاندر نے فتاد(۲)

اس وقت جوش میں کوئی اس کے برابر نہیں ہوتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ میرے ہی عشق کا اثر پروانہ اور شمع میں ہے اور میرے ہی جوش کا ظہور مے اور نے (۳) میں ہے اور یہ بات محض مبالغہ کے طور پر نہیں بلکہ حقیقت کے بھی موافق ہے۔

انسان عالم اکبر ہے

کیونکہ انسان عالم اکبر ہے اور عالم ناسوت (۴) عالم اصغر ہے اور عالم اصغر عالم اکبر سے مستفید (۵) ہے اس لیے جن چیزوں کا عالم ظاہر میں ظہور ہو رہا ہے سب قلب عارف کے آثار ہیں اگر اس طرح نہ سمجھو تو یوں سمجھو کہ خلق عالم سے (۶) انسان مقصود ہے تو انسان سب کی اصل ہے اور یہ عالم انسان کی فرع ہے (۷) اس لیے عارف کا یہ کہنا درست ہے کہ میرے ہی سے تمام چیزوں نے جوش و مستی کا سبق سیکھا ہے یعنی میری ہی وجہ سے ان کا ظہور ہوا ہے جس کے بعد یہ صفات ان میں پیدا ہوئیں اگر میں نہ ہوتا تو کسی چیز کا ظہور نہ ہوتا نہ کسی میں جوش و مستی کا اثر ہوتا یہاں پر کسی کو لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ(۸) سے شبہ نہ پیدا ہو کہ اس آیت میں سموات وارض کی خلقت کو انسان کی پیدائش سے بڑا بتلایا گیا ہے تو پھر انسان کو عالم اکبر اور عالم ناسوت کو عالم اصغر کہنا کیونکر صحیح ہوگا اور یہ انسان سے مستفید یا اس کی فرع کیونکر

(۱) ''روشن ہونا اور جلنا اور کپڑے پھاڑنا پروانہ نے ہم سے شمع نے ہم سے گل نے ہم سے سیکھا ہے''
(۲) ''جوش عشق ہے جو شراب میں ہے اور آتش عشق ہے جو بانسری میں ہے''(۳) بانسری (۴) دنیا (۵) دنیا انسان ہی سے مستفید ہو رہی ہے (۶) دنیا کو پیدا کرنے سے مقصود انسان کو پیدا کرنا ہے (۷) انسان بمنزل اصل اور دنیا بمنزل شاخوں کے ہے (۸) ''بالیقین آسمان اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کے پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے''

ہوسکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس جگہ اکبریت مادہ کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے یہاں معنی کے اعتبار سے اکبریت مقصود نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے معاد(۱) کو ثابت فرمایا ہے جس پر کفار کو اشکال تھا کہ انسان مرگل کر دوبارہ کیسے زندہ ہوگا اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے آسمانوں کو اور زمین وغیرہ کو پیدا کر دیا تو ایک مشت خاک انسان کا دوبارہ زندہ کر دینا اس پر کیا دشوار ہے کفار کو اعادہ جسم (۲) ہی پر اشکال تھا اس کو ایسی چیزوں کی خلقت (۳) سے دفع کیا گیا جو مادہ میں انسان سے بڑھی ہوئی ہیں سو اس درجہ میں عالم ناسوت کے لیے اکبریت مسلم ہے (۴)۔ گفتگو معنی اور مقصودیت میں ہے اور اس میں انسان سب سے اشرف واکمل ہے۔ چنانچہ اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں: ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا لا وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا(۵) یہاں اشدیت محض خلقت (۶) ظاہری میں مراد ہے اور مقصودیت کے اعتبار سے دوسری جگہ ارشاد ہے: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ(۷) جس سے معلوم ہوا کہ زمین وآسمان میں جو کچھ ہے سب انسان ہی کے لیے پیدا کیا ہے اور ارشاد ہے: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ(۸) اور وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ (۹) اس کے علاوہ بہت سی آیات میں بتلایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام چیزوں کو انسان کے لیے کسی کام میں لگا رکھا ہے پس اس درجہ میں انسان کا عالم اکبر (۹)

(۱) آخرت (۲) اس جسم کے دوبارہ پیدا ہونے پر ہی اشکال تھا (۳) پیدائش سے (۴) اس حیثیت سے دنیا کا بڑا ہونا تسلیم شدہ ہے (۵) ''بھلا کیا تمہارا پیدا کرنا سخت ہے یا آسمان کا اللہ نے اس کو بنایا اس کی سقف کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا'' سورۃ النازعات: ۲۷ تا ۲۹ (۶) ظاہری تخلیق میں یہ اشدیت مراد ہے (۷) ''وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لیے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف تو درست کر کے بنا دیئے ان کو سات آسمان'' سورۃ البقرہ: ۲۹ (۸) ''اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا تمہارے لیے'' سورۃ الجاثیہ: ۱۳ (۹) ''اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں، اور تمہارے نفع کے واسطے رات دن کو مسخر بنایا اور جو چیزیں تم نے مانگیں تم کو ہر چیز دی'' سورۃ الابراہیم: ۳۳، ۳۴ (۹) انسان کا سب سے بڑا عالم ہونا قرآن وحدیث کے خلاف نہیں۔

ہونا نصوص کے خلاف نہیں (باقی یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انسان اگر سب کی اصل ہے تو جسامت میں چھوٹا کیوں ہے کیونکہ اصل کے لیے جسامت میں فرع کے برابر یا بڑا ہونا لازم نہیں ۔ دیکھو درخت کی اصل ایک گٹھلی ہے جو جسامت میں درخت سے کوئی نسبت نہیں رکھتی مگر سارا درخت اسی ذرا سی گٹھلی کی فرع ہے ۱۲ جامع) پس اب کسی رند کے اس قول پر کچھ اشکال نہیں۔

افروختن و سوختن وجامہ دَرِیدن پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت (۱)

ایک رند کی حکایت

اس پر مجھے ایک ایسے ہی رند کی حکایت یاد آئی وہ حج کو جارہے تھے اور حالت یہ تھی کہ ایک ڈھپلی ہاتھ میں ناچتے کودتے ڈھپلی بجاتے جارہے تھے۔ لوگوں نے کہا میاں تم حج کو جارہے ہو یہ کیا حرکت ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں تم کون ہو، واقعی حق تعالیٰ سے اس کے بندوں کو ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اس جواب کے بعد کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں۔ غرض وہ اس طرح حج کو جارہے تھے یہاں تک کہ مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے اور مطوف کے ساتھ طواف کے لیے چلے جس وقت دروازہ حرم پر پہنچے تو مطوف نے کہا دیکھو وہ بیت اللہ ہے (بیت اللہ دروازہ کے باہر ہی سے نظر آجاتا ہے) پس بیت اللہ پر نظر کا پڑنا تھا کہ اس عاشق کو وجد طاری ہوا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور زبان پر یہ شعر تھا۔

چوں رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر کہ مبادا بار دیگر نہ رسی بدیں تمنا (۲)

بس یہ شعر پڑھتے پڑھتے دروازہ ہی پر گر پڑے اور جان دیدی ہائے وصل کی بھی تاب نہ ہوئی بس صورت دیکھتے ہی ختم ہوگیا، عاشق کی بھی عجیب حالت ہوتی ہے نہ اسے وصل میں چین ہے نہ فصل میں قرار ہے۔ بس وہ حال ہوتا ہے۔

من شمع جاں گدازم تو صبح دلکشائی سوزم گرت نہ بینم میرم چورخ نمائی
نزدیک آں چنانم دورآں چناں کہ گفتم نے تاب وصل دارم ونے طاقت جدائی (۳)

(۱) ''روشن ہونا شمع نے اور جلنا پروانہ نے اور کپڑے پھاڑنا گل نے ہم سے سیکھا ہے'' (۲) ''اب تو محبوب کے در پر پہنچ گئے ہو اب اپنی جان فدا کردو شاید پھر اس تمنا کے حصول کا موقع نہ ملے'' (۳) ''میں شمع ہوں تو صبح ہے اگر تجھے نہ دیکھوں تو تب بھی موت ہے کہ لوگ بجھادیں گے اگر دیکھوں تب بھی ہلاکت ہے کہ جل جاؤں گا اس محبوب کی نزدیکی ایسی ہے اور جدائی ایسی ہے جیسا کہ اوپر شعر میں ذکر کیا نہ جدائی کی طاقت نہ وصل کی تاب''

وصل کی تاب نہ تھی جب ہی تو دیکھتے ہی خم ہوگیا اے صاحب! اگر وہ بیت (۱) کے پاس ہی پہنچ جاتا تو کیا ہوتا وہ بیت سے پہلے رب البیت سے جاملا۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ جس کو ہم رندلاابالی سمجھ رہے تھے یہ عاشق عارف تھا پس اپنی حالت چھپانے کے لیے اس نے یہ صورت بنا رکھی تھی تمام مصالح کو خاک میں ملادیا تھا اس کی پروانہ تھی کہ کوئی کیا کہے گا مگر حالت یہ ہوتی ہے کہ اوپر کا مصالحہ تو جلانے سے خاک ہوگیا اور یہ گرم مصالحہ جو اندر اندر پھونکتا ہے باقی رہ گیا اس نے خود اسی کو جلا پھونک دیا۔ تو ان رندوں کے مزاح ودل لگی میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے تمام مصالح کو مسالہ کی طرح پیس دیتے ہیں اور اپنی وضع وناموس کو مٹا کر اپنی باطنی حالت کو پردہ میں رکھتے ہیں مگر اس غرض کے لیے ناجائز امور کا ارتکاب جائز نہیں ورنہ پھر وہ وضع سوز ہی نہ رہے گا شرع سوز بھی ہوجائے گا (۲) جس کے افعال قابل اعتبار نہیں نہ ان میں کوئی حکمت ہے تو اب ان حکمتوں پر نظر کر کے مزاح بھی لایعنی (۳) نہ رہا بلکہ مایعنی (۴) میں داخل ہوگیا اسی طرح تمام مباحات کو دیکھ لو کہ وہ اپنے اثر کے اعتبار سے یا مفید ہوتے ہیں یا مضر تو اب ایسی کوئی قسم نہ رہی جو نہ مفید ہو نہ مضر پس مباحات کو تیسری قسم نہ سمجھنا چاہئے بلکہ وہ بھی پہلی ہی دو قسموں میں داخل ہے یا محمود یا مذموم تو اب دو ہی قسم کے افعال ہوئے ایک وہ جو معین آخرت ہیں دوسرے وہ جو مضر آخرت ہیں۔

ایک مراقبہ کا القاء

اس کے بعد پھر ایک مراقبہ کی تعلیم کی گئی القاء کے طور پر تو جی چاہا کہ اپنے بھائیوں کو بھی بتلادیا جائے اس وقت جو حالت میرے اوپر غالب تھی ویسی تو اب نہیں رہی مگر خدا تعالیٰ کی ناشکری کیوں کروں بحمداللہ اب بھی بہت بڑا اثر قلب پر ہے، وہ مراقبہ یہ ہے کہ ہر کام کے وقت یہ سوچ لیا جائے کہ یہ کام جو ہم کررہے ہیں (یا کرنے والے ہیں) یہ آخرت میں مضر ہے یا مفید ہے۔ اس مراقبہ کے لیے کوئی وقت معین نہیں بلکہ یہ ایسا مراقبہ ہے کہ ہر وقت اس کا وقت ہے، چلتے پھرتے بھی اس کو سوچتے رہو اور کھاتے پیتے بھی اور باتیں کرتے ہوئے بھی اور رنج وغصہ میں بھی کوئی حرکت اور کوئی سکون

(۱) بیت اللہ (۲) وہ وضع کو ترک کرنے والا ہی نہیں بلکہ شریعت کو ترک کرنے والا بن جائے گا (۳) بیکار (۴) بلکہ کارآمد بن گیا۔

اس مراقبہ سے خالی نہ ہونا چاہئے۔ اس کے بعد آپ سے ان شاء اللہ تعالیٰ اول تو گناہ صادر ہی نہ ہوگا اور اگر بالفرض صادر ہوا(۱) بھی تو آپ اس وقت بیدار گناہ گار ہوں گے سرکش وغافل گناہگار نہ ہوں گے اور یہ بھی ایک بڑی دولت ہے کہ انسان کو گناہ کے وقت تنبہ ہوجائے کہ میں نے یہ کام گناہ کا کیا اس سے دل پر ایک ایسا چرکہ(۲) لگتا ہے جس کے بعد معاً توبہ واستغفار کو دل چاہتا ہے۔ شاید یہاں کوئی ذہین بیٹھے ہوں اور وہ اپنے دل میں یوں کہتے ہوں کہ یہ تو اور بھی برا ہوا کہ جان کر گناہ کیا تو اس وقت یہ شخص ویل للجاهل مرة وللعالم سبعين مرة (جاہل کے لیے ایک خرابی جاننے والے کے لیے ستر خرابیاں) کا مصداق ہوجائے گا تو بات یہ ہے کہ جان کر گناہ کرنا یہ کس نے کہا ہے کہ مطلقاً اشد ہے بلکہ علم کے ساتھ وہ گناہ اشد ہے جس کے ساتھ جرات بھی ہو ورنہ اگر جرات نہ ہو تو جان کر گناہ کرنا غفلت کے گناہ سے اشد نہیں اور اس مراقبہ کے ساتھ جرات تو کبھی ہوسکتی ہی نہیں تو اب یہ شخص بیدار گناہگار ہوگا کہ معصیت کو معصیت(۳) جانے گا غافل نہ ہوگا کہ یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں نے کوئی گناہ کا بھی کام کیا ہے یا نہیں اور اس بیداری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معصیت کے ساتھ خشیت بھی ملی ہوئی ہوگی اور حضرت خشیت(۴) اور معصیت اگر دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو گو وہ خشیت کامل نہ ہوگی مگر اس کے ساتھ معصیت بھی کامل نہ رہے گی، یہ خشیت ایسی چیز ہے کہ معصیت اس کے ساتھ کامل نہیں ہوسکتی اگر کامل خشیت ہے جب تو گناہ کا صدور ہی نہیں ہوتا اور اگر ناقص خشیت ہے تو اس کی وجہ سے معصیت بھی ناقص ہوجاتی ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے گرم پانی میں تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ملادو تو گو اس سے ٹھنڈا نہ ہوجائے گا مگر ویسا گرم بھی نہ رہے گا تو خشیت کے ساتھ معصیت کی یہ کیفیت ہوگی کہ اس وقت آپ اگر غیبت کریں گے تو دل کو حظ حاصل نہ ہوگا(۵) زبان سے غیبت کریں گے اور دل میں جوتے پڑتے ہوں گے کہ ہائے یہ میں نے کیا کیا تو یہ تھوڑا نفع ہے اس مراقبہ کا اس لیے میں یہ نہیں کہتا کہ اس مراقبہ کے بعد آپ سے گناہ کا صدور ہی نہ ہوگا بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر صدور ہوگا تو خشیت کے ساتھ ہوگا اور اس مضمون کے اظہار میں یہ بھی فائدہ ہے کہ اگر کسی کو تجربہ ہوا ہو کہ خشیت کے ساتھ بھی گناہ ہوجاتا ہے اور وہ اس وقت مولویوں کو جھوٹا کہتا ہو کہ یہ مولوی بھی

(۱) گناہ ہو بھی گیا (۲) زخم (۳) گناہ کو گناہ سمجھے گا (۴) خوف خدا (۵) دل کو مزہ نہیں آئے گا۔

بے پر کی باتیں اڑایا کرتے ہیں کہ خشیت وخوف دل میں پیدا ہوجانے سے گناہ نہیں ہوتے حالانکہ ہم نے تو آیات وعید واحادیث عقاب کا بہت مطالعہ کیا اور ان سے خوف بھی پیدا ہوا مگر پھر بھی گناہ موقوف نہیں ہوتے تو وہ اس مضمون کو سن کر مولویوں کو جھوٹا نہ کہیں گے کیونکہ جیسا ان کو خشیت کے ساتھ گناہ صادر ہونے کا تجربہ ہوا ہوگا کہ گناہ کے وقت دل میں ایک خلش بھی ساتھ ساتھ موجود تھی جس نے معصیت کو بھی ضعیف بنا کر گناہ بے لذت میں داخل کر دیا تھا تو صاحب جیسی خشیت آپ کو حاصل ہوئی تھی ویسا ہی اس نے اثر بھی کیا وہ بیکار تو نہ ہوئی پھر اب مولویوں کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں بات یہ ہے کہ خشیت کے تین درجے ہیں(۱)۔

خشیت اعتقادی

ایک خشیت اعتقادی یہ تو ہر مسلمان کو حاصل ہے کیونکہ ایمان نام ہی ہے خوف ورجا کا پس اس درجہ سے تو کوئی مسلمان خالی نہیں مگر اعتقادی خشیت گناہوں سے روکنے میں کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ استحضار خشیت(۲) کی بھی ضرورت ہے یہ دوسری قسم ہے پھر استحضار کے دو درجے ہیں ایک استحضار کامل دوسرے استحضار ناقص استحضار کامل کے ساتھ معصیت ہرگز نہیں ہوسکتی مگر ہم لوگوں کو استحضار کامل حاصل نہیں اور اسی کی ضرورت ہے لیکن استحضار کامل ای دو دن میں حاصل نہیں ہوا کرتا اس کے لیے مشق کی ضرورت ہے پہلے آپ استحضار ناقص ہی کیجئے اس سے گو معصیت کا انعدام نہ ہوگا(۳) مگر تقلیل(۴) ضرور ہوجائے گی اور وہی کیفیت ہوگی جو میں نے ابھی بیان کی ہے کہ خشیت ناقصہ کے ساتھ معصیت بھی ناقص ہی ہوگی اور معاً توبہ واستغفار(۵) کی توفیق ہوگی وہ حالت نہ رہے گی جو پہلے تھی کہ گناہ کر کے دل پر جوں بھی نہ رینگتی تھی پھر اسی حالت پر اکتفا نہ کیجئے بلکہ استحضار ناقص سے استحضار کامل کی طرف ترقی کیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ شدہ شدہ(۶) آپ ایک دن کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ میں نے اس لیے کہا شاید کوئی شخص اس مراقبہ پر عمل کرے اور ترک معاصی میں پوری کامیابی نہ ہو تو مایوس ہوجائے۔ تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ان حضرات کو سمجھ لینا چاہئے کہ دو چار روز کی مشق سے استاد مشاق نہیں بنا کرتے

(۱) خوف خدا کے تین درجے ہیں (۲) خوف کو ہر وقت پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے (۳) گناہ بالکل نہیں چھوٹیں گے (۴) کمی (۵) فوراً توبہ کی توفیق ہوگی (۶) آہستہ آہستہ۔

بلکہ استاد بننے کے لیے عرصہ تک مشق کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسے خوشنویسی حاصل ہوجاتی ہے چندروز کی کوشش سے مگر استاد بننے کے لیے عرصہ دراز کی ضرورت ہے اسی طرح قرآن حفظ کرلینا تو چندروز کا کام ہے مگر اس کا قابو میں آجانا ایک مدت چاہتا ہے پھر ان کاموں میں کمال حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے سب کو معلوم ہے کہ کام میں لگا رہنا اور مشق کا جاری رکھنا ہی اس کا طریقہ ہے پس یہی طریقہ عمل اس مراقبہ میں بھی جاری رکھئے چندروز میں کامیابی نہ ہو تو گھبراؤ نہیں ناامید نہ ہونا۔ امیدی راخدا گردن زدہ است (۱)

مولانا فرماتے ہیں ؎

کوئے نومیدی مرد کا میدہاست سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست (۲)

اور ایک جگہ فرماتے ہیں۔

اندریں رہ میتراش ومی خراش تادم آخر دم فارغ مباش (۳)

یعنی یہ ایک دن کا کام نہیں ساری عمر کا کام ہے لگے رہو کوشش کرتے رہو ان شاء اللہ ایک دن کامیاب ہوگے اور یہ حال ہوگا۔

تادمے آخر دمے آخر بود کہ عنایت با تو صاحب سر بود (۴)

اور یہ حال ہوگا

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور کلبہ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور (۵)

ان شاء اللہ ایک دن یہ غم ختم ہوجاوے گا اور کامیابی سے مسرور ہوگا۔

(رزقنا اللّٰہ تعالٰی وایاکم الوصول الیہ امین جامع) (۶) میں دعویٰ سے نہیں کہتا خدا کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ اس مراقبہ کو جاری رکھو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن ضرور کامیاب ہوگے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (جولوگ ہماری راہ میں ہمیشہ مشقتیں برداشت کرتے ہیں ان کو اپنے راستے ضرور دکھادیں گے وعدہ الٰہی ہے ۱۲ جامع) پس ہر کام پر اس

(۱) ناامیدی کی خدا نے گردن ماردی ہے (۲) ''ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے ناامید نہ ہو بلکہ امیدیں رکھو'' (۳) ''اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ ادھیڑبن میں لگے رہو اور آخری وقت ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو'' (۴) ''آخر وقت تو کوئی گھڑی آخر ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمزاد ورفیق بن جائیگی'' (۵) ''یوسف گم شدہ کنعان میں واپس آجائے غم مت کھا غموں کا تنگ وتاریک گھر کسی دن گلستاں ہوجائے گا غم مت کر'' (۶) ''اللہ تعالیٰ ہم اور تم کو وصول الی اللہ نصیب فرمائیں''

حیثیت سے نظر کرو کہ یہ معین فی المقصود ہے یا مضر(۱) پھر جو معین ہو اس کو اختیار کرو اور جو مضر ہو اس کو ترک کردو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جو بات میرے دل میں ہے وہ سامعین کے دل میں ڈال دوں، مگر کیونکر ڈال دوں یہ میرے اختیار سے باہر ہے اور الفاظ اس کے لیے کافی نہیں اور یہ ان لوگوں کے اعتبار سے کہتا ہوں جن کے دل میں یہ وارد پہلے سے نہ ہو اور جو پہلے سے اس کا ذوق رکھتے ہیں وہ تو اشارہ ہی سے سمجھ گئے ہوں گے مگر جو بات دل میں نہ پہنچائی جاسکے کم از کم اس کو کانوں میں تو ڈال دیا جاوے شاید کسی وقت ذوق حاصل ہو تو یہ کان میں پڑی ہوئی بات کام آئے گی اور چونکہ طویل مضمون یاد نہیں رہا کرتا اس لیے میں خلاصہ بیان کرتا ہوں کہ بس ہر کام سے پہلے اتنا سوچ لیا کرو کہ یہ نجات آخرت میں معین ہے یا نجات سے مانع ہے اور اس کا استحضار ہر کام میں رکھو خواہ مباح ہو یا فرض وواجب یا اور کچھ۔

وعظ الاسعاد والابعاد کا مفہوم

اور اسی غرض کے لیے میں نے اس وعظ کا نام (الاسعاد والابعاد تجویز کیا ہے اسعاد کے معنی ہیں اعانت اور ابعاد کے معنی ہیں تخیہ یعنی دور کرنا کذافی القاموس) تو یہ نام آپ کو اس مراقبہ کی یاددہانی کرائے گا کیونکہ وہ مراقبہ بھی اسی بات کا ہے کہ کون سا کام مقصود آخرت میں معین ہے اور کون سا مقصود سے دور کرنے والا ہے تو اب آپ کو لمبا مضمون یاد کرنا نہ پڑے گا بلکہ محض اس وعظ کا نام تصور معانی کے ساتھ اس مراقبہ کی یاد دہانی(۲) میں کافی ہوجائے گا اور یہ محض دو لفظ ہیں جن کا یاد کرنا دشوار نہیں یہ تجربہ ہے کہ الفاظ مختصرہ سے بڑے بڑے مضامین مستحضر ہوجاتے ہیں۔

حضرت تھانوی کی اختصار پسندی

میں نے تو مختصر الفاظ سے طالب علمی کے وقت میں بہت علوم حاصل کئے ہیں مجھے ابتداء سے اختصار محبوب ہے۔ کچھ طبیعت ہی اختصار پسند واقع ہوئی ہے جس کا سبب میری کاہلی بھی ہوسکتی ہے کیونکہ مجھے طول طویل کاموں کی ہمت نہیں خیر کچھ ہی سبب ہو باقی یہ تجربہ بالکل صحیح ہے کہ بعض دفعہ مختصر الفاظ سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں اور

(۱) مقصود حاصل ہونے میں مددگار ہے یا نقصان دہ (۲) وعظ کے نام کے تصور سے ہی مقصود ذہن میں آجائے گا کہ آخرت کے لیے مفید کام کروں مضر کاموں سے بچوں۔

میں نے تو اس سے بہت ہی کام لیا ہے۔ چنانچہ جس زمانہ میں جلالین پڑھتا تھا تو اس وقت میں نے یہ چاہا کہ جلالین کے جو دو حصے دو مصنفوں کے ہیں اس کو یاد رکھوں کہ پہلا کس کا ہے اور دوسرا کس کا کیونکہ جلالین ایک شخص کی تصنیف نہیں ہے بلکہ سورہ کہف سے اخیر تک جلال الدین محلّی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے اور انہوں نے اول حصہ کی بھی تفسیر شروع کی تھی، چنانچہ سورہ فاتحہ کی تفسیر لکھ بھی چکے تھے کہ عمر نے وفا نہ کی اور انتقال ہوگیا تو سورہ بقرہ سے سورہ اسراء تک علامہ جلال الدین سیوطی نے مکمل کی۔ چونکہ دونوں کا نام جلال الدین ہے اس لیے یہ یاد نہ رہتا تھا کہ پہلا حصہ کس کا ہے اور دوسرا کس کا تو میں نے دونوں کے لقب سے اول حرف لے لیا۔

چنانچہ سیوطی کے اول میں سین ہے اور محلی کے شروع میں میم ہے اور سین حروف ہجا میں میم سے مقدم ہے تو میں نے یہ جملہ یاد کرلیا الاول للاول والاخر للاخر یعنی پہلا حصہ اس کا ہے جس کے لقب کا پہلا حرف ترتیب ہجا میں مقدم ہے اور دوسرا اس کا ہے جس کے لقب کا پہلا حرف ترتیب میں موخر ہے۔ اس طرح سے یہ مضمون ہمیشہ یاد رہا۔

''اعیاھم'' میں ترتیب معراج

اسی طرح حدیث معراج میں یہ آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر آسمان میں خاص خاص انبیاء سے ملاقات کی اور اس کی ترتیب بھی احادیث میں مذکور ہے کہ پہلے آسمان میں آپ نے آدم علیہ السلام سے ملاقات کی اور دوسرے میں حضرت عیسیٰ ویحییٰ علیہما السلام سے ملاقات کی۔ تیسرے میں یوسف علیہ السلام سے اور چوتھے میں ادریس علیہ السلام سے اور پانچویں میں ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے میں موسیٰؑ علیہ السلام سے اور ساتویں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے۔ مگر یہ ترتیب یاد نہ رہتی تھی تو میں نے اس کے یاد کرنے کے لیے ایک مختصر لفظ بنالیا یعنی ''اعیاھم'' جس میں ہمزہ آدم علیہ السلام کے لیے اور عین عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ہے اسی طرح ہر نبی کے نام میں (۱) جو حرف اول تھا وہ اس جملہ میں لے لیا گیا ہے اور ہر ایک سے ملاقات کی ترتیب وہی ہے جو ترتیب حروف کی اس جملہ

(۱) الف آدم کا، عین عیسیٰ کا، یا یوسف کا، الف ادریس کا، ھا ہارون کا، میم موسیٰؑ کا۔ چنانچہ ان حروف کی ترتیب کے مطابق یہ انبیاء آسمان پر ہیں۔ پہلے آسمان پر آدمؑ، دوسرے پر عیسیٰؑ، تیسرے پر یوسفؑ، چوتھے پر ادریسؑ، پانچویں پر ھارونؑ، چھٹے پر موسیٰؑ۔

میں ہے مگر اس میں دو باتیں قابل تنبیہ ہیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کا کوئی حرف اس میں نہ آسکا اس جملہ میں صرف چھ حرف ہیں جس سے چھٹے آسمان تک کی ترتیب معلوم ہوسکتی ہے ساتواں حرف ایک اور ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام کی ترتیب پر بھی دلالت ہوجاتی اور اس کے لیے صرف یہ ممکن تھا کہ آخر میں الف بڑھا کر اعیاھما کردیا جاتا مگر اس کے معنی کچھ موزوں نہ ہوئے کیونکہ اعیاھم کے معنی تو یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب انبیاء کو سبقت سے عاجز کردیا اور یہ ایک عمدہ معنی ہیں اور اعیاھما میں ضمیر تثنیہ لانے سے یہ معنی ہوتے ہیں کہ آپ نے دو کو عاجز کردیا سو یہ معنی کچھ موزوں نہ معلوم ہوئے کیونکہ اس میں دو کی تخصیص بلاوجہ کرنی پڑتی ہے سو اتنی بات خود یاد رکھ لی جائے کہ اس میں ساتویں نبی کا نام مذکور نہیں جن سے ساتویں آسمان پر ملاقات ہوئی تھی اور یہ بھی یاد رکھ لیا جائے کہ ان کا نام ابراہیم علیہ السلام ہے دوسری بات یہ بھی یاد رکھ لی جائے کہ عیسی علیہ السلام کے ساتھ یحییٰ علیہ السلام بھی ہیں کہ وہ بھی دوسرے ہی آسمان پر ہیں ان کے لیے کوئی لفظ مستقل نہ آسکا اور اس جملہ میں جو تیسرا حرف یاء ہے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے نام کی علامت ہے جو ترتیب میں تیسرا حرف ہے وہ تیسرے ہی آسمان پر ہیں سو حرف عین سے ایک نبی کی طرف اشارہ ہوگیا اور دوسرے کو زبانی یاد رکھا اور یہاں سے معلوم ہوگا کہ یہ جو مشہور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فلک چہارم پر ہیں یہ غلط ہے نہ معلوم یہ کس طرح بے اصل مشہور ہوگیا۔ زیادہ تر یہ بات شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے جن میں بعض وہ شعراء بھی ہیں جو محقق ہیں مگر انہوں نے اس غلطی میں عوام کا اتباع کرلیا ہے اس لیے ہمیں ان کے کلام میں تاویل کی ضرورت نہیں۔

شاعروں کا مبالغہ

بلکہ صاف بات یہ ہے کہ بعض دفعہ شاعری میں محقق بھی مذاق عوام کی رعایت کرکے غیر محقق بات استعمال کرلیتا ہے مگر بحر العلوم نے ان کی رعایت کرکے یہ تاویل کی ہے کہ فلک چہارم سے مراد آسمان چہارم نہیں بلکہ کرہ چہارم مراد ہے اور آسمان دوم عدد کرات علویہ میں چوتھے نمبر پر ہے کیونکہ اس کے نیچے آسمان اول ہے اور اس کے نیچے کرۃ النار ہے اور اس کے نیچے کرۃ الہوا ہے اس طرح آسمان دوم چوتھا کرہ ہوا۔ اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ہوا کے نیچے کرۃ الماء اور اس کے نیچے کرۃ الارض بھی ہے تو اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ کرات سفلیہ ہیں اور گفتگو کرات علویہ میں ہے اس لیے ان دونوں سے نقض وارد نہیں ہوتا۔

دوسرے متکلم خود دوکرہ کے اوپر ہے اور اس کے اوپر صرف عناصر کے دو ہی کرے ہیں ہواونار۔ خیر کسی کو یہ تاویل پسند ہوتو وہ یہ تاویل کرکے مولانا رومی وغیرہ کے کلام کو درست کرلے جنہوں نے عیسٰی علیہ السلام کو آسمان چہارم پر مانا ہے بعض شعراء تو ایسا غضب کرتے ہیں کہ ایک شاعر نے عیسٰی علیہ السلام کو فلک چہارم پر مان کر انہیں بیمار بھی مانا ہے کہتا۔

بر آسمان چہارم مسیح بیمار است تبسم تو برائے علاج درکار است(۱)

یعنی وہ اپنی معشوق چرمی سے کہتا ہے کہ آسمان چہارم پر مسیح بیمار ہیں بھلا مسیح اور بیمار۔ وہ تو مردوں کو زندہ کرتے اور اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے وہ بیمار ہوں گے اور خیر زمین پر رہتے ہوئے تو بیمار ہونا کچھ تعجب خیز نہ تھا یہ تو ان کو آسمان پر بیمار مانتا ہے بھلا وہاں بیماری کا کیا گزر۔ جب وہاں عیسٰی علیہ السلام نہ زمین کی غذائیں کھاتے ہیں نہ وہاں ان کو بول وبراز(۲) کی حاجت ہوتی ہے، نہ وہاں کسی قسم کا تعفن(۳) ہے تو وہاں بیمار ہونا کیسا۔ پھر بیماری کا علاج بھی ان کے معشوق چرمی کا تبسم ہی میسر ہوا۔ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ ایک نبی (علیہ السلام) کا علاج اپنے محبوب کے تبسم کو بتلاتا ہے مگر شعراء کو اس کی کچھ پرواہ نہیں بس انہیں تو یہ چاہئے کہ شعر بن جائے چاہے عقل وشعور پر اس سے پردہ ہی پڑ جائے اور غضب یہ اس مرض میں بعض عارفین بھی مبتلا ہیں وہ کسی معشوق چرمی کے مقابلہ میں تو انبیاء کی توہین نہیں کرتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں بعض ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے دوسرے انبیاء کی توہین ہوجاتی ہے چنانچہ جامی فرماتے ہیں۔

غلامے بود یوسف زر خریدہ (۴)

خدا معاف کرے ان حضرات کو میرا تو رونگٹا کھڑا ہوتا ہے اس معنی کے تصور سے بھی بھلا یوسف علیہ السلام کو غلام کہنا اور زرخرید کہنا کیا یہ تھوڑی بات ہے۔ بہت سخت بات ہے مگر شعراء اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ میں ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے ہر شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ انبیاء کی شان میں کونسی بات کہنے کی ہے اور کون سی بات کہنے کی نہیں وہ یہ کہ تصور کرلیا جائے کہ اگر کسی مجمع میں وہ نبی موجود ہوں جن کی شان میں ہم نے یہ بات کہی ہے تو کیا اس مجمع میں ان کے سامنے ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں، یا کم از کم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(۱) ''چوتھے آسمان پر (نعوذ باللہ) عیسٰی علیہ السلام بیمار ہیں تیرا تبسم ان کے علاج کے لیے درکار ہے''
(۲) پیشاب پاخانہ (۳) بدبو (۴) ''یوسف زرخریدہ ایک غلام ہے''

کے سامنے آپ کے بھائیوں کے متعلق ہم یہ مضمون پڑھ سکتے ہیں۔ بس جو بات ایسی ہو جس کے متعلق دل گواہی دے کہ اس کو ہم ان پیغمبر کے سامنے کہہ سکتے ہیں وہ تو کہو اور جس میں کھٹکا پیدا ہو کہ سامنے یہ بات نہیں کہہ سکتے اس کو اپنے کلام میں سے نکال دینا چاہئے۔ یہ بہت بڑا معیار میں نے آپ کے ہاتھ میں دیدیا ہے اس کو مستحضر (۱) رکھ کر شعراء اپنے کلام میں اصلاح کر سکتے ہیں۔ الغرض میں نے لفظ اعیاھم سے اس ترتیب کو یاد کیا تھا جس ترتیب سے حضور ﷺ نے معراج میں حضرات انبیاء سے آسمانوں پر ملاقات فرمائی ہے تو میں نے مختصر الفاظ سے بہت کام لیا ہے۔ اسی بنا پر میں نے اس وعظ کا نام ایسا تجویز کیا جو اختصار کے ساتھ آپ کو اس مراقبہ کی یاد دہانی کرے گا میں نے بہت دیر میں اس بات کو کہا جو مجھے اس وقت کہنی تھی اور بات بھی مختصر ہی تھی جس کے لیے اتنی دیر کی ضرورت نہ تھی نہ اتنی دیر کی نیت تھی مگر خود بخود دیر ہوگئی لیکن حرج ہی کیا ہے یہ وہ باتیں نہیں ہیں جن کے زیادہ ہونے سے ہیضہ ہو جب ماکولات میں بھی بعض ایسی چیزیں ہیں جن کے زیادہ کھانے سے ہیضہ نہیں ہوتا جیسے خربوزہ کو لوگ بتلاتے ہیں تو کیا معقولات میں ایسا ہونا کچھ دشوار ہے۔

انطباق آیت متلوہ

اب میں اس مضمون کا انطباق آیت متلوہ پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (۲) یہ معنی معطوف ہے قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَاحَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (۳) جو قل کے تحت میں ہے تقدیر یہ ہوئی قُلْ تَعَالَوْا الخ وقل وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا (۴) اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس جگہ اَنَّ مکسورہ ہوتا کیونکہ قول کے تحت میں اَنَّ مکسورہ ہی آیا کرتا ہے اور ایک قراءت میں مکسورہ ہے بھی مگر ہماری قراءت میں اَنَّ مفتوحہ ہے جس کی وجہ صحت یہ ہے کہ اس قراءت میں یہاں اخبر (خبر دیدیجئے) مقدر ہے جس کے ملانے کے بعد لفظاً یہ قل کے اوپر معطوف ہے اس لیے منصوب ہوگیا گو معناً تعالوا پر عطف ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ (لوگوں کو) بتلا دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا اس کا اتباع کرو۔ هذا سے مذکور سابق کی طرف اشارہ ہے اوپر

(۱) پیش نظر رکھ کر (۲) ''یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو'' سورۃ الانعام: ۱۵۳ (۳) ''آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے'' سورۃ الانعام: ۱۵۱ (۴) ''آپ کہہ دیجئے یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے''

تقریباً دس احکام اوامر ونواہی کا مجموعہ مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہے:قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَاحَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَانُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَاقُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا(۱)

’’آپ (ان سے) کہئے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے وہ (چیزیں یہ ہیں ایک) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ (پس شریک ٹھہرانا حرام ہوا) اور دوسرے یہ کہ ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (پس ان سے بری طرح رہنا حرام ہوا) اور (تیسرے یہ کہ) اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کیا کرو (زمانہ جاہلیت میں اس کی عادت تھی کہ اولاد کو زندہ درگور کردیتے تھے (کیونکہ) ہم تم کو اور ان کو دونوں کو رزق (مقدر) دیں گے (وہ تمہارے رزق مقدر میں شریک نہیں ہیں پھر کیوں قتل کرتے ہو پس قتل کرنا حرام ہوا) اور (چوتھے یہ کہ) بے حیائی (یعنی بدکاری) کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ (پس زنا کرنا حرام ہوا) خواہ وہ علانیہ ہو یا پوشیدہ اور (پانچویں یہ کہ) جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کردیا ہے اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق (شرعی) پر قتل جائز ہے مثلاً قصاص یا رجم میں پس قتل ناحق حرام ہوا) اس (سب) کا تم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ تاکہ تم (ان کو) سمجھو (اور سمجھ کر عمل کرو) اور (چھٹے یہ کہ) یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف نہ کرو) مگر ایسے طریقے سے (تصرف کی اجازت ہے) جو شرعاً مستحسن ہے (مثلاً اس کے کام میں لگانا اس کی حفاظت کرنا اور بعض اولیاء واوصیاء کو اس میں یتیم کے لیے تجارت کرنے کی بھی اجازت ہے جس کا حکم فقہ میں مذکور ہے) یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جاوے (اس کے بعد اس کا مال اس کو دیدیا جائے گا بشرطیکہ سفیہ

(۱) سورۃ الانعام:۱۵۱۔۱۵۳

یعنی بے وقوف نہ ہو پس تصرف غیر مشروع مال یتیم میں حرام ہوا) اور (ساتویں یہ کہ) ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو انصاف کے ساتھ (کہ کسی کا حق اپنے پاس نہ رہے اور نہ آوے پس آپس میں دغا کرنا حرام ہوا۔ اور آگے بتلاتے ہیں کہ یہ احکام کچھ دشوار نہیں جن پر عمل دشوار ہو کیونکہ) ہم (تو) کسی شخص کو اس کے امکان سے زیادہ (احکام کی) تکلیف نہیں دیتے (پھر ان احکام میں کوتاہی کی کیا وجہ) اور (آٹھویں یہ کہ) جب تم فیصلہ یا شہادت وغیرہ کے متعلق) کوئی بات کیا کرو تو (اس میں) انصاف (کا خیال) رکھا کرو گو وہ شخص (جس کے مقابلہ میں وہ بات کہہ رہے ہو) قرابت دار ہی ہو (پس خلاف عدل حرام ہوا) اور (نویں یہ کہ) اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا کرو (جیسے قسم یا نذر) اس کو پورا کیا کرو (بشرطیکہ وہ نذر و قسم خلاف شرع نہ ہو پس اس کا عدم ایفاء حرام ہوا)''

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ اس کا اتباع کرو پس گو هذا کا مرجع یہ امور مذکورہ ہیں لیکن یہ اشارہ علی سبیل التخصیص نہیں بلکہ علی سبیل التعمیم ہے یعنی وہ دین جس کے یہ احکام بطور نمونہ کے ہیں سب کا سب واجب الاتباع ہے اور اشارہ میں تعمیم کی وجہ ظاہر ہے کہ وجوب اتباع کچھ انہی احکام میں منحصر نہیں اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ انہی کے ساتھ مخصوص پس هذا کے بعد صراطی فرمانا خود قرآن میں ان کے علاوہ اور بہت سے احکام مذکور ہیں اور احادیث میں بہت سے احکام موجود ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ لوگوں سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ کچھ انہی احکام کی تخصیص نہیں بلکہ دین اسلام اور اس کے سب احکام جن میں سے بعض اوپر مذکور ہوئے ہیں میرا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو پس هذا سے حقیقت میں دین اسلام کی طرف اشارہ ہے جو احکام مذکورہ کے ضمن میں اجمالاً مفہوم ہو چکا ہے اور ان احکام تسعہ مذکورہ(۱) کے ذکر کے بعد هذا سے مجموعہ دین کی طرف اشارہ کی وجہ صحت یہ بھی ہے کہ یہ احکام مذکورہ گو ظاہر میں چند احکام ہیں مگر حقیقت میں یہ سارے اسلام کا خلاصہ ہے کیونکہ ان میں عقائد و معاملات و معاشرت و عبادات کے مہتم بالشان امور سب مذکور ہیں اور اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ یہ احکام سب محکوم ہیں (۲) جو کسی شریعت میں کبھی منسوخ نہیں ہوئے اس طرح یہ گویا تمام شریعت کا خلاصہ ہے پھر وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا (یہ دین میرا راستہ ہے) میں

(۱) ان نو مذکورہ احکام (۲) یہ ایسے احکامات ہیں جو حضرت آدمؑ سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر شریعت میں تھے

صراحۃً تعمیم کردی گئی جس سے بقیہ احکام غیر محکمہ بھی اجمالاً سب مذکور ہوگئے اور صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حق تعالیٰ نہیں ہیں بلکہ حضور ﷺ ہیں کیونکہ یہاں حضور ﷺ کو حکم ہورہا ہے کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ یہ آیت معنی ''تعالوا'' پر معطوف ہے جو ''قل'' کے تحت میں ہے اور لفظ یہاں اخبر محذوف ہے پس خطاب قل واخبر (آپ کہہ دیں اور خبر دیدیں) کے بعد ضمیر متکلم کا مرجع قائل ہی ہوسکتا ہے اور قائل حضور ﷺ ہیں تو اس ضمیر کا مرجع بھی آپ ہی ہیں چنانچہ اس کی نظیر دوسری جگہ بھی مذکور ہے۔ کہ وہاں بھی دین اسلام کو حضور ﷺ کا راستہ کہا گیا ہے۔

صراط الرسول ﷺ دراصل صراط اللّٰہ ہے

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱) اور اسلام کو حضور ﷺ کا راستہ کہنا بطور دعوت کے ہے کہ آپ اس طریق کے داعی ہیں ورنہ حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے چنانچہ بعض جگہ حقیقت کے موافق ارشاد ہے وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۲) اس پر یہ سوال وارد ہوگا کہ جب حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے (۳) تو پھر ہر جگہ حقیقت کے موافق کلام کیوں نہیں فرمایا بعض جگہ مجازاً اس کو صراط رسول اللہ ﷺ (۴) اور بعض جگہ حقیقت کے موافق صراط اللّٰہ کیوں فرمایا تو جواب اس کا یہ ہے کہ بعض جگہ حضور ﷺ کی طرف اس صراط کو اس لیے مضاف کردیا گیا تاکہ سامعین کو اس پر عمل کرنے کی ہمت ہو اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستہ کو طے کرسکتے ہیں اگر پہلے ہی یہ فرمادیا جاتا کہ یہ خدا کا راستہ ہے اس پر چلو تو لوگ یہ سن کر گھبرا جاتے۔

حق سبحانہ وتعالیٰ کی شان

کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات تک ذہن کی رسائی اولاً دشوار ہے تو ان کی تو یہ شان ہے۔

(۱) ''آپ فرمادیجئے یہ میرا طریق ہے میں خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی'' سورہ یوسف: ۱۰۸ (۲) ''اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ایک سیدھے راستہ کی ہدایت کررہے ہیں یعنی اس خدا کے راستہ کی کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے'' (۳) اللہ کا راستہ (۴) رسول کا راستہ

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم وزہرچہ گفتہ اند وشنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم(۱)

خدا تعالیٰ کی ذات تک وہم بھی نہیں پہنچ سکتا جو کچھ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں آتا ہے خدا تعالیٰ اس سے بھی وراءالوراءثم وراءالوراء(۲) ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

در تصور ذات او را گنج کو تادر آید در تصور مثل او(۳)

یہ لفظ سارے نسخوں میں گنج ہے۔ مثنوی کو جس کنج (اور جس گوشہ) سے نکالو گے سب میں یہی نکلے گا کسی کے پاس اس کی کنجی نہ تھی۔ صرف حضرت حاجی صاحب ہی کے پاس اس کی کنجی تھی حضرت ہی نے اس کا قفل کھولا۔ حضرت نے مکہ مکرمہ میں ایک دفعہ ایک شیخ کو کنج پڑھاتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کے معنی بنانے میں وہ بہت تاویلیں کررہے تھے مگر کوئی بات نہ بنتی تھی حضرت نے صلاح دی کہ یہ لفظ گنج ہے بمعنی گنجائش کے بس اس کو سن کر وہ شیخ پھڑک ہی تو گئے۔ اب شعر کے معنی بے تکلف ظاہر ہو گئے مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کی کسی کے تصور میں گنجائش نہیں یعنی تصور بالکنہ کی گنجائش نہیں حق تعالیٰ کا بالکنہ ذہن میں آنا محال ہے جس کی تفصیل کتب معقول میں مذکور ہے جب حق تعالیٰ کی ذات تک کسی کی رسائی نہیں تو اگر ابتداء ہی اسلام کو صراط اللہ کہہ دیا جاتا یعنی حق تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی تو لوگ گھبرا جاتے اور اس سوچ میں پڑ جاتے کہ حق تعالیٰ تو ذہن سے بہت دور ہیں پس اسی طرح ان کا راستہ بھی نہ معلوم کتنا دور دراز ہوگا اس لیے پہلے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کیا گیا کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ تو میرا راستہ ہے اس پر چلو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کی رسائی ممکن ہے آپ عیاناً سب کے سامنے ہیں (۴) پھر بشریت (۵) میں سب کے شریک ہیں اس لیے یہ سن کر ہمت بندھی کہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور آپ ذہن سے بہت دور نہیں ہیں تو آپ کا راستہ بھی دور نہ ہوگا بلکہ نزدیک ہوگا یہ فائدہ ہوا

(۱) ''اے اللہ آپ وہم وگمان وقیاس سے بالاتر ہیں جو کچھ بزرگوں نے کہا تھا اور ہم نے سنا اور پڑھا اس سے بھی بالاتر ہیں۔ دفتر تمام ہوگیا اور عمر اختتام کو پہنچی ایک وصف بھی آپ کا بیان نہ کرسکے'' (۲) خدا کی ذات اس سے بھی بالا وبرتر بلکہ اس بالا وبرتر سے بھی بالا وبرتر ہے (۳) ''اس کی ذات کے تصور میں کہاں گنجائش ہے تاکہ اس کا مثل تصور میں آجائے'' (۴) آپ کی ذات گرامی سب لوگوں کے سامنے ہے (۵) بشر ہونے میں سب کے ساتھ شریک ہیں۔

آپ کی طرف نسبت کرنے سے کہ راستہ کا نزدیک وسہل ہونا(۱) معلوم ہوگیا پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک رسائی ہوگئی اور اس راستہ پر چلنا شروع ہوا اب حقیقت منکشف ہوئی(۲) کہ یہ تو حقیقت میں خدا کا راستہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف داعی ہیں آپ خود بھی اسی راستہ پر چل رہے ہیں یہ دیکھ کر ڈھارس بندھ گئی کہ حق تعالیٰ اس کے طے کرنے میں بندوں کی امداد فرماتے ہیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس راستہ کو طے کرلیا ہے معلوم ہوا کہ اس کا طے کرنا انسان کی قدرت سے خارج نہیں تو ہم بھی اس کو طے کرسکتے ہیں خصوصاً جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (جو واقف طریق ہیں)(۳) ہمارے معین ورفیق ہیں(۴)۔ واقعی اگر حق تعالیٰ کی امداد نہ ہوتو پھر اس راہ کا طے کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ خدائی راستہ ہے جس کو وہی طے کرسکتا ہے جس کو حق تعالیٰ طے کرانا چاہیں اسی لیے سالک کو جب اس پر نظر ہوتی ہے کہ یہ راستہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اس وقت وہ بڑا پریشان ہوتا ہے اور اس کے طول ولامتناہی(۵) کے خیال سے گھبراتا ہے اور یوں کہتا ہے۔

بحر یست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست آنجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست(۶)

اور جب اس پر نظر کرتا ہے کہ یہ راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ ہے جس پر آپ چل رہے ہیں تو اس کی ہمت بندھتی ہے اور یوں کہتا ہے۔

تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من پیادہ می روم و ہمرہاں سوار انند(۷)

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعانت ورفاقت سے اس راستہ میں چلنے کا ارادہ کرلیتا ہے۔ یہ تو ان لوگوں کے لیے ہے جن کی رسائی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ہوچکی ہے۔

مشائخ کا دامن صراط الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چلنے کا وسیلہ ہے

اور جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بھی وصول نہ رکھتے ہوں ان کو اس کی ضرورت ہے کہ ان مشائخ کا دامن پکڑیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک رسائی حاصل کرچکے ہیں (جیسے بادشاہ تک پہنچنے کے لیے وزیر کا واسطہ ضروری ہے مگر جو وزیر تک بھی نہ پہنچا ہو اس کو چاہئے کہ

(۱) آسان (۲) حقیقت کھلی (۳) راستہ سے واقف ہیں (۴) مددگار وساتھی (۵) لمبے اور لامحدود ہونے سے (۶) ''دریائے عشق ایسا دریا ہے کہ اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اس جگہ جان سونپنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے'' (۷) ''اے خضر راہ تو ہی میرا ہاتھ پکڑ کہ میں پیدل ہوں میرے ہمراہی سوار ہیں''

ان لوگوں کی خوشامد کرے جو وزیر تک رسائی رکھتے ہیں ۱۲ جامع) شیخ فرید فرماتے ہیں۔

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق عمر بگذشت نشد آگاہ عشق(۱)

گر ہوائے ایں سفر داری ولا دامن رہبر بگیر و پس برآ(۲)

اور مولانا فرماتے ہیں۔

یار باید راہ را تنہا مرو بے قلاؤز زا اندریں صحرا امرو(۳)

قلاؤز سے مراد قل اعوذ (۴) یا مولوی نہیں بلکہ قلاؤز کہتے ہیں رہنما کو یہ ترکی لغت ہے گو وہ قلاؤز ہوگا قل اعوذ یا ہی (۵)۔ مطلب یہ ہے کہ اس راستہ کو رہنما کے بغیر طے نہ کرو ورنہ بہت پریشان ہوگے اور راستہ طے نہ ہوسکے گا۔ آگے فرماتے ہیں۔

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید ہم بعون ہمت مرداں رسید(۶)

اس میں جواب ہے اس سوال کا کہ ہم تو بعض اولیاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ بدوں رہنما کے واصل ہوگئے ظاہر میں ان کا کوئی شیخ نہ تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اول تو یہ نادر ہے(۷) والنادر کالمعدوم (نادر مثل معدوم کے ہوتا ہے) اس لیے تو ارد سے نقض وارد نہیں ہوسکتا۔ دوسرے یہ کہ جس کو تم ظاہر میں بدوں کسی رہنما کے واصل دیکھتے ہو وہ حقیقت میں ایسا نہیں واقع میں وہ بھی کسی رہنما کے واسطہ سے واصل ہوا ہے گو ظاہر میں اس کا کوئی شیخ نہیں مگر وصول اس کو بھی عون ہمت مردان طریق سے ہوا ہے یعنی اہل اللہ میں سے کسی نے اس پر نظر کی ہے جس کی برکت سے وہ واصل ہوگیا ہے گو اس شخص کو اس کی خبر بھی نہ ہو کہ مجھ پر کسی نے نظر کی ہے۔ حضرات اہل اللہ کے احسان کی یہ شان ہوتی ہے کہ بہت لوگوں کو ان کے احسان کی خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ ان کے لیے دعائیں کرتے تھک گئے ہیں۔

---

(۱) ''بے پیر اور رہبر کامل کے جو شخص اس عشق کے راستہ میں چلا عمر گزر گئی مگر عشق سے باخبر نہ ہوا'' (۲) ''اے دل اگر اس سفر محبت کے طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو رہبر کامل کا دامن پکڑ اور پیچھے آ'' (۳) ''راستہ طے کرنے کے لیے دوست تلاش کرو تنہا اس کوچے میں قدم نہ رکھو۔ غیر رہبر کے اس صحرا سے گزرنے کی ہمت نہ کرنا'' (۴) ابتدائی درجہ کا مولوی نہیں ہے (۵) اگرچہ وہ بڑے درجہ کا راہنما وہی ہوگا جس نے ابتداء سے تعلیم حاصل کی ہوگی (۶) ''اگر کسی نے شاذ و نادر اس راہ سلوک کو تنہا بے صحبت پر قطع کر بھی لیا تو وہ بھی غائبانہ پیروں کی توجہ سے پہنچا ہے'' (۷) ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے

حضرت مجدد قدس سرہ کا ایک واقعہ

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ کا واقعہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں ایک بزرگ صاحب سلسلہ تھے جن سے بہت فیض جاری تھا مگر حضرت مجدد صاحب کو ان کی بابت مکشوف ہوا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا(۱)۔ پس حضرت مجدد صاحب یہ دیکھ کر تڑپ ہی تو گئے آپ کے دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا ایک شخص شقی(۲) ہو کر مرے اور وہ شخص بھی کیا جس سے ہزاروں کو دین کا فیض ہو رہا ہے۔ آپ نے اس کے لیے دعا کرنی چاہی مگر ڈرے کہ اس میں حضرت حق کی مزاحمت نہ ہو(۳) کہ تقدیر مکشوف ہونے کے بعد اس کے خلاف کی دعا کرتا ہے مگر پھر حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ کا مقولہ یاد آیا کہ میں وہ شخص ہوں کہ حق تعالیٰ سے کہہ کر میں شقی کو سعید کرا سکتا ہوں۔ اس پر مجدد صاحب کی بھی ہمت ہوئی۔ معلوم ہوگیا کہ ایسی دعا کرنا خلاف ادب نہیں چنانچہ پھر تو آپ نے اس کے لیے بہت دعائیں کیں اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح اس شخص کی شقاوت کو مبدل بہ سعادت کر دیا جائے(۴) حتی کہ آپ کو مکشوف ہوگیا کہ حق تعالیٰ نے اس کو سعید کر دیا تب آپ کو چین آیا تو دیکھئے مجدد صاحب نے اس شخص کے حق میں در پردہ کتنا بڑا احسان فرمایا مگر اس شخص کو خبر بھی نہ تھی اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ میرے واسطے کسی شخص کے دل پر کیا گزر رہی ہے راتوں کو نیند اس کی اڑ گئی ہے۔ خیر یہ واقعہ تو ہوگیا مگر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ تقدیر کس طرح بدل گئی جس کے متعلق ارشاد ہے مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (۵)

حضرت مجدد صاحب نے اس شبہ کا جواب بھی خود ہی دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض امور کے متعلق لوح محفوظ میں اطلاق ہوتا ہے(۶) اور واقع میں وہ کسی قید کے ساتھ مقید ہوتے ہیں مگر وہ قید لوح محفوظ میں مذکور نہیں ہوتی بلکہ وہ علم الٰہی میں ہوتی ہے تو اس شخص کے متعلق لوح محفوظ میں تو صرف اتنا ہی تھا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا مگر علم الٰہی میں اس کے ساتھ ایک قید تھی یعنی بشرطیکہ کوئی مقبول بندہ اس کے لیے دعا نہ کرے سو یہ واقعہ تقدیر کے خلاف نہیں ہوا کیونکہ تقدیر اصل میں علم الٰہی کا نام ہے۔ اسی

(۱) بدبختی (۲) نامراد (۳) خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہو (۴) اس کی نامرادی کو بامرادی میں بدل دیا جائے (۵) میرے نزدیک قول نہیں بدلتا سورہ ق:۲۹ (۶) مطلق حکم لکھا ہوا ہوتا ہے مگر وہ مقید ہوتا ہے اور وہ قید لوح محفوظ میں مکتوب نہیں ہوتی۔

لیے یہ حضرات ام الکتاب کی تفسیر علم الٰہی سے کرتے ہیں کیونکہ اس میں تغیر وتبدل کبھی نہیں ہوسکتا۔ پس دراصل ام الکتاب وہی ہے گولوح محفوظ بھی کتاب المحودوالاثبات کے اعتبار سے ام الکتاب ہے کیونکہ لوح محفوظ میں اتنا تغیر وتبدل نہیں ہوتا جتنا کتاب المحودواثبات میں ہوتا رہتا ہے مگر فی الجملہ تغیر اس میں ہوسکتا ہے اور ہوجاتا ہے۔ اور جو تقدیر علم الٰہی کے درجہ میں ہے اس میں اس کا اصلاً احتمال نہیں۔ پس حقیقت کے اعتبار سے ام الکتاب وہی ہے اور اس تفسیر کے اعتبار سے کلام نفسی کے درجہ میں قرآن کے قدیم ہونے کی دلیل نص سے نکل سکتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ یعنی قرآن ہم سے غایت قرب کے درجہ میں علی حکیم ہے یہ غایت قرب لدی کا مدلول ہے اور غایت قرب ذات حق سے مرتبہ صفات کو ہے تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن مجید درجہ صفت میں ''علی حکیم'' ہے اور قرآن کا جو درجہ صفت ہے وہی کلام نفسی ہے اور اسی لیے اس کو ''علی حکیم'' کہا گیا اور ''علی حکیم'' کا اطلاق قرآن مجید میں کسی حادث پر نہیں آیا تو لدینا اور علی حکیم دونوں کی دلالت اس کے صفت ہونے اور قدیم ہونے پر ہوئی اور اس کے قبل جو ارشاد ہوا ہے اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا(۱) اس کا جعل کا مفعول ہونا اور عربیۃ کے ساتھ موصوف ہونا قرینہ ہے کہ اسی سے کلام لفظی کا درجہ مراد ہے تو دونوں آیتوں میں دونوں درجوں کا بیان نہایت وضاحت سے ہوگیا خیر یہ تو بیچ میں ایک علمی لطیفہ تھا مقصود میرا یہ تھا کہ اہل اللہ بعض دفعہ اس طریقہ سے بعض لوگوں پر احسان فرماتے ہیں کہ ان کو خبر نہیں ہوتی بھلا اگر مجدد صاحب بیان نہ فرماتے تو ان بزرگ کو اس احسان کی اطلاع کیسے ہوتی اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگ حضرت مجدد صاحب کے معتقد ہوں گے اگر معتقد نہ ہوتے تو اس احسان کو تسلیم کرنے کے بجائے مجدد صاحب پر نہ معلوم کیا کیا اعتراض کرتے یہ ہے ہم بعون ہمت مردان رسید (مردان خدا کی توجہ سے پہنچے) اور یہ بھی ان بزرگ کی سعادت کی علامت تھی کہ انہوں نے مجدد صاحب پر اعتراض نہیں کیا بلکہ تسلیم سے کام لیا ان حضرات پر انکار نہ کرنا بھی بڑی دولت ہے اہل اللہ کے ساتھ انکار سے پیش آنا بڑا وبال ہے بلکہ کام کی بات تو یہ ہے کہ اپنے چھوٹوں پر بھی حقیر سمجھ کر انکار سے پیش آنا بڑا وبال ہے بلکہ کام کی بات تو یہ ہے کہ اپنے چھوٹوں پر بھی حقیر سمجھ کر انکار اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہیں خدا کے نزدیک

(۱) ''ہم نے اس کو قرآن عربی کردیا''۔

بڑے ہوتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تربیت وتعلیم بھی نہ کرو کیونکہ تعلیم میں تحقیر و بے ادبی نہیں بلکہ تعلیم تو ادب ہی ہے کیونکہ ہر چیز کا ادب اس کے مناسب ہوتا ہے چھوٹوں کا ادب یہی ہے کہ ان کی تربیت وتعلیم کی جائے۔ یہاں تک تو لفظ صراطی کے متعلق بیان تھا آگے فرماتے ہیں مستقیماً یعنی یہ راستہ مستقیم ہے۔ لفظ مستقیم کے معنی ایک تو لغوی ہیں یعنی اقصر الخطوط الواصلة بين النقطتين (نقطوں کے درمیان میں جو خطوط واصل ہوسکیں ان میں جو سب سے چھوٹا ہو وہ مستقیم لغوی ہے) اور ایک معنی عرفی ہیں یعنی بے خوف وخطر راستہ۔ عرف میں راہ راست کو کہتے ہیں جس میں کوئی خطرہ نہ ہو چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں گاؤں کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ اس کو چلے جاؤ حالانکہ اس میں موڑ بھی آتے ہیں مگر مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ راستہ بے خطر ہے اس میں تم کو غلطی پیش نہ آئے گی۔ صاف سڑک پڑی ہوئی ہے اور یہی عرفی معنی اس شعر میں مراد ہے۔

راہ راست برو اگرچہ دوراست(۱)

بے خطر راستہ صراط حق ہے

اگر راہ راست کے معنی عرفی نہ لیے جائیں تو لغوی معنی کے اعتبار سے اگرچہ دور است (اگرچہ دور ہو) نہیں بن سکتا کیونکہ جو راستہ لغۃ مستقیم ہوگا وہ اوروں سے دور کبھی نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے اقصر الطرق ہونا لازم ہے(۲) جن لوگوں کو مستقیم کے لغوی اور عرفی معنی میں فرق معلوم نہیں وہ اس شعر کو حل نہیں کر سکتے مگر اس تحقیق کے بعد مطلب صاف ہے کہ بے خطر راستہ کو اختیار کرو اگرچہ وہ دور ہی کیوں نہ ہو یہ تو لفظ کی تحقیق تھی اب میں کہتا ہوں کہ صراط حق یعنی اسلام کے متعلق یہ دونوں معنی مراد ہوسکتے ہیں کیونکہ صراط مستقیم بے خطر بھی ہے اور وصول الی اللہ میں وہ تمام طرق سے اقرب واقصر بھی ہے(۳) تو آپ کو اختیار ہے کہ چاہے مستقیم کو لغوی معنی پر محمول کیجئے یا عرفی پر (یا دونوں پر ۱۲) یہاں سب کی گنجائش ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (۴) یعنی اس راستہ (اسلام) کا اتباع کرو اور

(۱) ”بے خطر راستہ پر چلو اگرچہ دور ہو“ (۲) سب راستوں سے چھوٹا ہونا لازمی ہے (۳) اللہ تک پہنچنے میں سب سے قریب تر اور چھوٹا ہے (۴) سورۃ الانعام: ۱۵۳۔

دوسرے مختلف راستوں کا اتباع نہ کرو ورنہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے جدا اور دور کر دیں گے اور دور ہونا اس طرح کا نہیں ہے کیونکہ وہ موصل تو ہوتے ہیں، نقطہ مقصودہ سے دور تو نہیں کرتے بلکہ اس طرح کی دوری ہے۔ جیسے مثلث کی ایک ساق کو چھوڑ کر اگر دوسری ساق پر چلنے لگے تو ساق اول سے وقتاً فوقتاً بعد ہی بڑھتا جاتا ہے جیسے اقصر الخطوط کے سوا تمام خطوط واصلہ دور دراز ہوا کرتے ہیں اور جدا ہونا زیادہ ظاہر ہے کیونکہ بے خطر راستہ کو چھوڑ کر خطرناک راستہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مقصود تک وصول میسر نہیں ہوتا بیچ ہی میں ہلاک ہوجاتا ہے اور ایک بات یہاں اور قابل توجہ ہے وہ یہ کہ پہلے توصراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے جس میں اس راستہ کی طرف اضافت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھی اور یہاں ''عن سبیلہ'' بضمیر غائب فرمایا گیا ہے اس کا مرجع حق تعالیٰ ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں ورنہ سبیلی بیاء متکلم فرماتے ہیں سو اس کی توجیہ کی اس لیے کوئی ضرورت نہیں کہ یہ اضافت تو حقیقت کے موافق ہے۔ توجیہ کی ضرورت توصراطی میں تھی جس کا نکتہ میں بیان کر چکا ہوں اس کے بعد ارشاد ہے۔

وَصّٰکُم کا مفہوم

ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ اس کی خدا تعالیٰ نے تم کو وصیت فرمائی ہے تاکہ تم تقویٰ حاصل کرسکو۔ وصیت کرنے سے مراد تاکیدی حکم دینا ہے کیونکہ وصیت اصل میں اس بات کو کہتے ہیں جو انسان اپنے مرنے کے وقت عزیزوں اور وارثوں سے کہا کرتا ہے چونکہ وہ انسان کا آخری وقت ہوتا ہے اس لیے اس وقت جو بات کہتا ہے وہ خاص ضرورت کی باتیں ہوتی ہیں جن کی تعمیل کو وہ بہت موکد ولازم (۱) کیا کرتا ہے چونکہ حق تعالیٰ عدم وفنا سے پاک ہیں اس لیے یہاں پر وصیت کے معنی متعارف تو ہو نہیں سکتے بلکہ اس کا لازم مراد ہے یعنی حکم تاکیدی لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ یہ نتیجہ ہے اتباع صراط مذکور کا مطلب یہ ہے کہ تم اس راستہ پر چلو تو امید ہے کہ تم کو وصال مقصود حاصل ہوجائے گا اس طرح سے تم نجات آخرت سے کامیاب ہوجاؤ گے کیونکہ تقویٰ کے معنی لغت میں بچنے کے ہیں تو حاصل یہ ہوا کہ تم عذاب سے بچے رہو گے۔

(۱) جن کی بجا آوری کی وہ بہت تاکید کرتا ہے

خلاصہ نجات

اور یہی خلاصہ ہے نجات کا اور شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کمال دین کو کہتے ہیں چنانچہ موارد نصوص (۱) میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجائے گی۔ اس تفسیر پر مطلب یہ ہوا کہ اس راستہ پر چلنے سے تم کو کمال دین حاصل ہوجائے گا اور یہی حاصل ہے مقصود پر پہنچنے اور منزل پر وصول ہوجانے کا اس کے بعد میں اس آیت کو مضمون پر منطبق کرنا چاہتا ہوں گو اس تفصیل کے بعد تقریر انطباق کی ضرورت نہیں رہی مگر میں تبرعاً (۲) اس کو بھی بیان کئے دیتا ہوں تاکہ پوری تسلی ہوجائے کہ آیت مضمون مقصود پر بسہولت منطبق ہے۔ سو اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ هٰذَا صِرَاطِیْ سے دین اسلام کی طرف اشارہ ہے اور اسلام گو لغۃ نام ہے مجموعہ اعمال کا اور عقائد اس میں مجازاً داخل ہیں اور حقیقۃً عقائد ایمان کا مدلول ہیں اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ایمان فعل قلب ہے اور اسلام فعل جوارح (۳) اور یہ اصطلاح لغوی ہے کیونکہ ایمان کے معنی تصدیق کے ہیں جو اولاً بالذات قلب (۴) سے صادر ہوتی ہے اور اسلام کے معنی گردن نہادن بطاعت ہیں (۵) جس کا محل جوارح ہیں (۶) اور بعض نصوص میں بھی اسلام وایمان کا اطلاق اس حقیقت کے موافق وارد ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا (۷) لیکن یہ حقیقت لغویہ ہے اصطلاح شرعی میں اسلام نام ہے مجموعہ عقائد واعمال کا اور ایمان نام ہے مجموعہ عقائد کا۔ تو شرعاً اسلام عام ہے اور ایمان خاص اور ایمان پر هذا صراطی سے جو اسلام کی طرف اشارہ ہے اس سے یہی اسلام شرعی مراد ہے جو عقائد واعمال سب کو شامل ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ اوپر قل تعالوا (آپ کہیے کہ آؤ) میں عقائد واعمال دونوں کا ذکر ہے اس کے بعد وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) فرمایا گیا ہے تو اس میں مجموعہ عقائد واعمال کی طرف اشارہ ہونا مناسب ہے اور ان اعمال وعقائد کو جو صراط فرمایا گیا تو تخصیص ان ہی اعمال وعقائد کی مقصود نہیں یہ تو بطور تمثیل کے فرمایا ہے مقصود اتباع صراط اسلام کا ہے جو تمام اصول وفروع کو شامل

(۱) قرآن وحدیث میں غور کرنے سے (۲) بطور استحسان (۳) ایمان یعنی عقیدہ کا تعلق دل سے اور اسلام یعنی افعال کا تعلق اعضاء سے ہے (۴) تصدیق دل سے ہوتی ہے (۵) اسلام کے معنی فرمانبرداری اختیار کرنے کے ہیں (۶) اعضاء (۷) ''اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لائے آپ کہہ دیجئے تم ایمان نہیں لائے یہ کہو کہ ہم اسلام لائے'' سورۃ الحجرات: ۱۴۔

ہے۔ البتہ ایک تحقیق سمجھنے کی یہاں ضرورت ہوگی وہ یہ کہ اوپر بعض نواہی کا ذکر ہے جیسے لَا تُشْرِكُوْا وَلَا تَقْتُلُوْٓا وَلَا تَقْرَبُوْا (مت شریک کرو اور مت قتل کرو اور نہ قریب جاؤ اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کرو) اور بعض مامورات کا ذکر ہے جیسے وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ، وَاَوْفُوا الْكَيْلَ، وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا (والدین کے ساتھ احسان کرو ناپ تول پوری کرو) اور ان سب کو صراطی فرمایا۔ اس کے اتباع کا امر فرمایا تو صراطی کہیں فعل ہوگا کہیں ترک اور اتباع فعل سے ہوگا کہیں ترک سے غرض هذا صراطی سے مراد تمام وہ اعمال ومامورات ہیں جو معین آخرت ومفید مقصود ہیں (۱) جن کا مفید ہونا مستقیماً میں مدلول ہے کہ استقامت کے لیے موصول الی المقصود ہونا لازم ہے اور وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (۲) میں تمام وہ اعمال آگئے جو مانع عن الاخرت ومضر للمقصود ہیں (۳) اور مضر ہونا متفرق سے ظاہر ہے۔ پس ان مقدمات سے حاصل یہ ہوا کہ ہم کو ہر کام میں یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ فعل معین آخرت ہے یا مضر آخرت ہے اب اس میں تمام شریعت آگئی کوئی مضمون شریعت اس کا اس سے خارج نہیں رہا۔ اس لیے اس آیت کے تحت میں تمام شریعت کا ذکر ہوسکتا ہے۔ اسی واسطے میں نے ابتداء میں کہا تھا کہ اس آیت کی تفصیل عمر بھر میں بھی بیان نہیں ہوسکتی اور وہ ایک شخص کی عمر نہیں بلکہ ایک جماعت کی عمر جو فی نفسہ گو متناہی ہو مگر بمعنی لا تقف عند حد غیر متناهی (غیر متناہی کہ کسی حد پر نہ ٹھہرے) ہو۔ پس اس میں وہ احکام بھی داخل ہیں جو اس ماہ رواں یعنی شعبان کے متعلق یا ماہ آئندہ رمضان کے متعلق شریعت میں وارد ہیں۔

احکام شعبان

لہٰذا میں احکام شعبان کو بھی اس کے تحت میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور رمضان کے متعلق اگر موقع ملا تو پھر کبھی بیان ہوجائے گا۔ شعبان کی بابت حدیث میں یہ خاص فضیلت مذکور ہے۔ اذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا نهارها فان اللّٰه تبارك وتعالٰى ينزل فيها لغروب الشمس الى السماء الدنيا فيقول الامن مستغفر لى فاغفرله الا من

(۱) ایسے تمام اعمال جو آخرت کے لیے مفید ہوں (۲) ''دوسری راہ پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کردیں گی'' (۳) جو آخرت سے روکنے والے اور مقصود کے حصول میں نقصان دہ۔

مسترزق فارزقه الا مبتلی فاعافیه الا کذا الا کذا حتی یطلع الفجر رواه ابن ماجه سنده ضعیف کما یدل علیه تصدیر المنذری ایاه بلفظ روی وهو علامته الضعف کما صرح به فی خطبته کتابه اه ترغیب ص ۱۷۹ لکنه تجمل فی فضائل الاعمال۔ جامع (سنن ابن ماجہ: ۱۳۸۸) یعنی حق تعالیٰ اس مہینے کی پندرھویں رات میں غروب ہی کے وقت سے آسمان اول کی طرف نزول فرماتے ہیں۔ جیسا نزول ان کی شایان شان ہے اس میں ہم کو کاوش کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی ممانعت بھی ہے کیونکہ یہ متشابہات میں سے ہے پھر فرماتے ہیں کہ کوئی مغفرت کا طالب ہے؟ کہ میں اس کی مغفرت کردوں، کوئی روزی کا طالب ہے کہ میں اس کو روزی دوں، کوئی بیمار (طالب شفا) ہے کہ میں اس کو عافیت دوں، اسی طرح بہت سے امور کے متعلق فرماتے رہتے ہیں کہ کوئی ایسا ہے کوئی ایسا ہے یہاں تک کہ طلوع فجر تک یہی معاملہ رہتا ہے۔ سبحان اللہ! یہ اس رات کی کتنی بڑی فضیلت ہے گویا یوں کہنا چاہئے کہ اس رات حق تعالیٰ ہمارے گھر پر تشریف لاتے ہیں کیونکہ آسمان اول ہمارے گھر کی چھت ہے اور محبوب کا چھت پر آجانا گھر ہی میں آجانا ہے تو بس ہمارا حال اس شعر کے مصداق ہوتا ہے۔

امروز شاہ شاہاں مہمان شد است مارا جبریل باملائک دربان شد است مارا(۱)

اب اس کو خود سوچ لو کہ جب محبوب گھر میں مہمان ہو تو عاشق کا کیا حال ہوتا ہے جناب خوشی کے مارے رات بھر نیند نہیں آتی۔ یہی جی چاہا کرتا ہے کہ ساری رات محبوب سے باتیں کرتا رہوں خصوصاً جس کا محبوب ایسا ہو جو اپنے عشاق کی باتیں سننے سے گھبراتا بھی نہ ہو نہ اس کو نیند آتی ہو نہ غنودگی ستاتی ہو ایسے محبوب کا عاشق تو ہرگز اس رات میں نہ سووے گا جس میں محبوب اس کے گھر پر آیا ہو۔ پس اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس رات میں قیام کا امر بھی نہ فرماتے جب بھی صرف اس خبر کا کہ حق تعالیٰ اس رات آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں مقتضا یہی تھا کہ ہم اس رات کو عبادت وذکر میں گزاریں اور رات بھر بیدار رہیں چہ جائیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے۔ قوموا لیلها وصوموا نهارها (۲) مگر وہ شاہ شاہاں ایسا مہربان ہے کہ مہمان ہو کر بھی تمہیں سونے سے نہیں روکتا تم کو سونے کی اجازت مگر باوجود اس طرح سے اجازت ہونے کے پھر بھی یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ جیسے اور ویسے ہی اس روز، کچھ تو کرنا چاہئے۔ رات بھر جاگنے کی ضرورت نہیں بلکہ

(۱) ''آج بادشاہوں کا بادشاہ ہمارا مہمان ہے جبرائیل وملائک ہمارے دربان ہیں'' (۲) ''اس کی رات میں شب بیداری کرو اور دن میں روزہ رکھو''

اچھا بھی نہیں کیونکہ حدیث میں ہے۔ احب الاعمال الی اللّٰہ ادومھا(۱) بہتر عمل خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس پر دوام کیا جائے(۲) سو شعبان کی اس شب میں اتنا جاگنا چاہئے جس پر نباہ ہوسکے یہ نہیں کہ ایک مرتبہ تو ساری رات جاگ لئے اور دوسری مرتبہ کچھ بھی نہیں شاید کوئی صاحب اس حدیث کو سن کر یہ کہیں کہ یہ دوام تو بڑا سر لگا سال میں ایک رات تو کچھ دیر جاگنا آسان تھا سال بھر کون جاگے۔ ارے صاحب! آپ گھبرائیں نہیں میں سال بھر کی راتوں میں آپ کو نہیں جگاتا بلکہ آپ سال میں ایک ہی رات جاگ لیا کیجئے رہا یہ شبہ کہ اس صورت میں دوام کہاں ہوا تو میں کہتا ہوں یہ بھی ایک صورت دوام کی ہے کہ سال میں ایک رات ہمیشہ جاگ لیا کرے جیسے روٹی پر آپ کو دوام ہے مگر اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ ہر وقت کھایا کرے یا کپڑے بدلنے پر دوام ہے کہ ہفتہ میں ایک بار یا دو بار بدلا کرتے ہیں اس دوام کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر وقت کپڑے بدلے جائیں پس اسی طرح سال بھر میں ایک رات جاگنے کا التزام کرلینا یہ بھی دوام ہے بشرطیکہ یہ ایک رات ناغہ نہ ہو تو اس رات میں اتنی مقدار بیداری کے لیے معین کرنی چاہئے کہ جس پر ہمیشہ کم از کم اس رات میں تو دوام ہوجایا کرے چاہے ایک ہی گھنٹہ ہو۔

عمل قلیل کے دوام میں برکت

بلکہ میں اس سے ترقی کرکے کہتا ہوں کہ چاہے دو ہی رکعت ہوں کچھ تو ہوں پس قلیل عمل بھی دوام کے ساتھ عمل کثیر بغیر دوام سے بہتر ہے اگر دو رکعت بھی کسی سے نہ ہوسکیں تو کم از کم ایک مرتبہ استغفار ہی اس رات میں کرلیا کرے التزام کے ساتھ یہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ کافی ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب کا شعر ہے۔

بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہنچے وہاں گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ وفریاد ہم

سبحان اللہ یہ علوم ہیں حاجی صاحب کے۔ حق تعالیٰ نے حاجی صاحب کو کتنا سہل راستہ(۳) الہام فرمایا تھا۔ بس وہی انبیاء کا راستہ ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے جس کی شان یہ ہے سھلتہ بیضاء نقیة لیلھا ونھارھا سواء حضرت حاجی صاحب کی یہی تعلیم تھی کہ کچھ کرنا چاہئے قلیل ہی ہو پس تم ہر شعبان میں اس رات کے لیے کچھ کام مقرر کرلو یہ بھی دوام ہے اگر تمام رات بیدار نہ رہ سکو تو جتنا ہوسکے پانچ منٹ ہی سہی اور حدیث میں آتا

(۱) الصحیح لمسلم المسافرین: ۲۱۸ (۲) جو ہمیشہ کیا جائے (۳) آسان راستہ

ہے اس رات سب کی مغفرت ہوجاتی ہے (جو بھی مغفرت طلب کرے ۱۲) سوائے مشرک اور مشاحن کے یعنی جن دو شخصوں میں دنیوی عداوت وکینہ ہو ان کی بھی مغفرت نہیں ہوتی بلکہ کہہ دیا جاتا ہے ان کو ابھی رہنے دو جب تک یہ صلح کرلیں قلت رواہ البیھقی من طریق العلاء بن الحارث عن عائشتہ رضی اللہ عنہا وقال ھذا مرسل جید یعنی ان العلاء لم یسمع من عائشتہ واللہ سبحانہ وتعالی اعلم کذا فی الترغیب ۔ اللہ اللہ کینہ بھی کتنا گناہ ہے کہ اس کو شرک کے ساتھ جمع کیا گیا ہے کہ جس طرح مشرک کی مغفرت اس رات میں نہیں ہوتی اسی طرح کینہ ور کی بھی مغفرت نہیں ہوتی اب تو مسلمانوں میں کینہ بہت ہی بڑھ گیا ہے حالانکہ اس میں ہر مسلمان کا وہ مشرب ہونا چاہئے تھا جو صوفیہ کا ہے وہ یوں کہتے ہیں۔

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن (۱)

(کینہ کو کفر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ قریب بکفر ہے اور اس کی دلیل حدیث مذکور میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشاحین کو مشرک کے ساتھ جمع فرمایا ۱۲) مگر اب تو صوفیوں میں بھی یہ بات نہیں رہی ان میں کینہ بغض کی کثرت ہونے لگی حالانکہ مسلمانوں کو تو یہ دعا تعلیم کی گئی ہے وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے اللہ ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ پیدا نہ کیجئے ۱۲) تو اس مرض سے بچنا چاہئے مگر آج کل مسلمان اپنے بھائیوں ہی سے کینہ بہت رکھتے ہیں غیروں سے تو اتحاد کی کوشش کی جاتی ہے ان کو غیر قوموں سے اتنا کینہ نہیں ہوتا جتنا اپنے بھائیوں سے ہوتا ہے افسوس! پس اس رات سے پہلے ہر شخص کو اپنے دل میں سے مسلمانوں کی طرف سے کینہ نکال دینا چاہئے ورنہ اس کی مغفرت نہ ہوگی اس دن کے ختم ہونے کے بعد (اس دن چودھویں تاریخ تھی) جو رات اب آرہی ہے وہی لیلۃ النصف من شعبان ہے۔ جس کا نام شب برات ہے۔ مگر حلوے مانڈے والوں کے یہاں آج ہی شب برات ہے واقعی ان بدعات کے ساتھ عقل بھی خبط ہوجاتی ہے یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ دن کو شب کہتے ہیں شاید چودھویں تاریخ کو اہتمام کرنے سے پندرہویں رات ہی مقصود ہوتی ہوگی اسی اہتمام کے سبب چودھویں تاریخ ہی کو شب برات کہنے لگے۔ دوسری غلطی یہ کہ بقرعید کی طرح شب برات کا بھی عرفہ کیا جاتا ہے یہاں کے لوگ تو عرفہ کو نہ جانتے ہوں مگر لکھنؤ وغیرہ میں آج سے ایک دن پہلے آفت شروع ہوگئی ہوگی پھر وہ عرفہ ہی نہیں ہوتا بلکہ

(۱) ''ہمارے طریق میں کینہ رکھنا کفر ہے ہمارا آئین ہے سینہ کو مثل آئینہ صاف رکھنا''

اس میں صرفہ (۱) بھی کیا جاتا ہے۔ یہ سب قصہ پیر جیون کا نکالا ہوا ہے انہوں نے اپنے کھانے کے واسطے ایک تو چودھویں ہی تاریخ سے شب برات شروع کردی پھر اس کا عرفہ نکالا تا کہ بار بار مٹھائی حلوا ملے واللہ اگر ان کو مٹھائی وغیرہ نہ دو تو یہ خود بدعات سے توبہ کرلیں۔ ان کا آسان امتحان یہ ہے کہ ان سے فاتحہ خوب دلواؤ۔ مولود خوب پڑھواؤ اور کچھ دود لاؤ نہیں۔ پھر دیکھو جب ان پر مفت کی مشقت پڑے گی وہ خود ان کو بدعات کہنے لگیں گے۔

کانپور میں ایک مولوی صاحب کسی رئیس کے یہاں مولود پڑھنے گئے درمیان میں آپ نے ایک شعر پڑھا اور وجد ظاہر کرکے اپنا کرتہ جھر سے پھاڑ ڈالا۔ یہ معاملہ دیکھ کر گھر والے نے اسی وقت بزاز (۲) کے یہاں سے اس بدذات (۳) کے واسطے کپڑا منگایا (کیونکہ اس میں ان کی سبکی تھی (۴) کہ مولوی صاحب ان کے گھر آئے تھے سر ننگے اور جائیں گے ننگے ۱۲) تو یہ لوگ دنیا وصول کرنے کے لیے ایسی ایسی ترکیبیں کرتے ہیں اگر ان کو کچھ نہ دیا جاوے اس وقت سب بدعات کی حقیقت خود ہی کھل جائے گی۔ لوگ خواہ مخواہ دلائل سے ان کو طے کرنا چاہتے ہیں حالانکہ حق وناحق کا امتحان اس ترکیب سے بآسانی ہوسکتا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی گو معقولی تھے (۵) مگر خوش عقیدہ تھے ان سے کسی نے پوچھا کہ حضرت مولود پڑھنا کیسا ہے، فرمایا بڑی برکت کی چیز ہے اس کی ادنیٰ برکت تو یہ ہے کہ مولود خواں کو کم از کم دو حصے تو ضرور ہی ملتے ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک خان صاحب مولانا کے پاس آئے تھے وہ اس زمانہ میں مستاجری کرتے تھے جس کا بھوپال وغیرہ میں بہت رواج تھا تو مولانا نے خان صاحب سے پوچھا کہ آج کل تو وصولیابی کے دن ہیں آپ یہاں کیسے آگئے۔ خان صاحب بولے کہ میں تو گاؤں کو بڑے پیر صاحب کے سپرد کرآیا ہوں۔ مولانا نے فرمایا اچھا ہم تو اب تک یہ سمجھتے تھے کہ بڑے پیر صاحب ولی ہیں مگر آپ کے قول سے معلوم ہوا کہ پدھان بھی ہیں جو زمین وجائیداد کا بھی انتظام کرلیتے ہیں۔ غرض ان بدعات کا کچھ خاصہ ہے کہ ان سے عقل بھی خبط ہوجاتی ہے۔

(۱) خرچہ (۲) کپڑے کی دکان والے سے (۳) اس بے ہودہ انسان کے لیے (۴) ان کے لیے شرمندگی کا باعث تھی
(۵) منطقی

بدعات کا خاصہ

اور منشا سب کا وہی پیٹ کا دھندا ہے۔ یہ پیٹ انسان سے سب کچھ کراتا ہے۔ چنانچہ بدعات شعبان میں بھی انہی حضرات کی برکت کا ظہور ہوتا ہے مسلمان کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ جو کام کرے یہ دیکھ لے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو کیا ہے یا نہیں یا اشارۃً دلالۃً اس کی ترغیب دی ہے یا نہیں چنانچہ شعبان کی اس رات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا حلوا وغیرہ کچھ نہیں پکوایا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام نہیں کیا تو تم کیوں کرتے ہو۔ شیخ سعدی نے خوب فرمایا ہے۔

بزہد و ورع کوش وصدق وصفا لیکن میفزائے برمصطفا

(یعنی زہد وورع وصدق وصفا میں کوشش کرو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بڑھ نہیں سکتا بلکہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنا چاہتا ہے وہ اور نیچے کو گر جاتا ہے ۱۲ جامع)

بھلا ان بدعات میں تو بعض منکرات ایسے مختلط (۱) ہیں جن کی وجہ سے ان کو مباح (۲) بھی نہیں کہا جاسکتا لیکن اگر کوئی کام منکرات سے خالی بھی ہو اور فی نفسہ مباح ہو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار نہ کیا ہو تو عارفین اس کو بھی پسند نہیں کرتے بلکہ ان ہی کاموں کو پسند کرتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً ثابت ہیں۔

کھانے میں حضرت ضامن شہید کا اتباع سنت

چنانچہ مولانا گنگوہی (قدس سرہ) فرماتے تھے کہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار فرمایا کہ بھائی بزرگوں نے تو ہر لقمہ اور ہر گھونٹ پر الحمد للہ کہنے کی ترغیب دی ہے اور یہی ان کا معمول بھی ہے مگر ہم کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے محبت ہے کہ بس ایک بار شروع کھانے میں بسم اللہ کہہ لے اور ایک بار فراغت کے بعد الحمد للّٰہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین (۳) کہہ لیا مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ حافظ صاحب نے یہ کیا اچھی بات فرمائی اھ! اتباع سنت اس کا نام ہے مگر ہم لوگوں نے تو محض نام ہی

(۱) بعض ممنوع باتیں اس قدر ملی ہوئی ہیں (۲) جائز (۳) ''سب تعریف ہے اللہ ہی کے لیے جس نے ہم کو کھلایا اور پلایا اور مسلمانوں میں سے کیا'' الصحیح لمسلم کتاب الذکر والدعاء: ۴۶۔

یاد کرلیا ہے پس اتباع سنت اسی میں ہے کہ اس زمانہ کے متعلق جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہی کیا جائے اور اپنی طرف سے کچھ زیادتی نہ ایجاد کی جائے شعبان کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک تو یہ ثابت ہے کہ پندرھویں رات کو کچھ اور راتوں سے زیادہ بیدار رہا جائے۔ دوسرے یہ ثابت ہے کہ پندرھویں تاریخ کو روزہ رکھا جائے اس روزہ کا بہت ثواب ہے اور حکمت اس دن کے روزہ کی اور اس کی رات کے قیام کی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ نصف شعبان کا وقت مقدار و کیفیت وغیرہ میں رمضان کے وقت کے مماثل ہوتا ہے چنانچہ اس کے بعد رمضان تک دن کی زیادتی کمی میں نمایاں فرق نہیں ہوتا چند منٹوں ہی کا تفاوت ہوتا ہے نیز موسم میں بھی کچھ زیادہ تغیر نہیں ہوسکتا پندرہ دن میں کوئی معتد بہ تفاوت نہیں ہوا کرتا جیسی گرمی ۱۵ شعبان کو ہوگی بس قریب قریب اسی کے یکم رمضان کو ہوگی تو اس دن کے روزہ کی اور اس کی رات کے قیام کی ترغیب میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اس دن کا روزہ رکھ کر اور اس کی رات کو جاگ کر امتحان کرلو کہ بس رمضان کا روزہ بھی ایسا ہی ہوگا اور تراویح کی نماز بھی ایسی ہی ہوگی جیسے اس رات کا جاگنا۔ پھر گھبراتے کیوں ہو میں اس حکمت کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر مجھے یہ حکمت معلوم ہوتی ہے اور گو یہ حکمت مقصود نہ ہو مگر اس دن کے صیام (۱) اور رات کے قیام پر یہ فائدہ مرتب تو ضرور ہوتا ہے کہ اس سے رمضان کے صیام و قیام کا نمونہ معلوم ہوکر اس کی ہمت بندھ جاتی ہے اور مجھے یہی حکمت معلوم ہوتی ہے۔ حدیث اذا انتصف شعبان فلاصوم الاعن رمضان (۲) (جب شعبان نصف گزر جائے اور گزر جانے کے ترجمہ سے خود پندرہویں تاریخ کا اس سے خارج ہونا مفہوم ہوگیا کیونکہ نصف متیقن پندرہویں کے بعد ہی گزرتا ہے نہ اس سے پہلے" تو رمضان کے سوا اور روزہ نہیں) کہ اس سے بھی رمضان کے لیے ہمت کا تازہ رکھنا مقصود ہے اگر نصف شعبان کے بعد روزے رکھے گئے تو ان سے لحوق ضعف (۳) کا اندیشہ ہے جس سے شاید رمضان کے روزوں کی ہمت پست ہوجائے اور اگر نصف شعبان کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہے گی تو وہ ہمت جو ایک روزہ کے امتحان سے پیدا ہوچکی تھی کمزور نہ ہوگی باقی احکام شرعیہ کی مصالح کا احاطہ کون کرسکتا ہے یہ بھی حق تعالیٰ کا انعام ہے کچھ تھوڑی بہت حکمتیں ہم جیسوں کو بھی بتلادی جاتی ہے جن سے ضعیف

(۱) روزے (۲)" جب نصف شعبان گزر جائے تو سوائے رمضان کے روزہ نہ رکھا جائے" کشف الخفاء للعجلونی: ۱/ ۴۷۸ (۳) کمزوری لاحق ہونے کا اندیشہ ہے

الایمان لوگوں کو تسلی ہوجاتی ہے ورنہ مسلمان کا اصل مذاق تو یہ ہونا چاہئے۔

زباں تازہ کردن باقرار تو نگیختن علت از کار تو(۱)

اب میں ایک مضمون اور بیان کرنا چاہتا ہوں اور اسی پر بیان کو ختم کردوں گا کیونکہ وقت بہت گزر گیا عصر کی نماز بھی قریب ہے یہ مضمون پہلے ایک علمی رسم سے ظاہر ہو چکا ہے اور اس کی اجمالی کیفیت ایک مختصر تقریر سے معلوم ہوچکی ہے۔ میں مضمون کو بھی اسی آیت میں داخل کرتا ہوں یہ مضمون دستار بندی علماء ہے گو اس میں ہم لوگوں کی اغراض مختلف ہوگئی ہیں جن میں بعض اغراض خراب بھی ہیں کہیں اس سے اپنی کارگزاری کا اظہار مقصود ہوتا ہے کہیں چندہ کی کوشش کے لیے اس قسم کے جلسوں کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اور چندوں میں حدود شرعیہ کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہیں اسکی حقیقت اور اس فعل کے درجہ کو واضح نہیں کیا جاتا جس سے عوام کو غلطی اور خود فارغ شدہ جماعت کو بھی دھوکہ ہوتا ہے لوگ ان لوگوں کو ابھی سے مقتدا اور معتمد سمجھنے لگتے ہیں اور خود فارغ شدہ جماعت بھی اپنے متعلق یہ اعتقاد کرلیتی ہے کہ بس ہم آج سے مقتدا ہوگئے باقی اصل مقصود اس تقریب سے تعلیم کا اہتمام اور غیر فارغ شدہ جماعت کو تکمیل کی رغبت دلانا ہے اور حقیقت اس کی وہ ہے جس کو میں عنقریب بیان کروں گا۔ رہا یہ کہ ہماری غرض اس وقت اس تقریب سے کیا تھی سو یہ بات گو مجھے اپنے آپ نہ بیان کرنی چاہئے تھی مگر خدا تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر بیان کرتا ہوں بحمداللہ یہاں اس تقریب سے نہ مدرسہ کی شہرت مقصود ہے اور اس مختصر جلسہ سے جس کے لیے کوئی تداعی واہتمام مطلق نہیں کیا گیا اس کا وہم ہی کیا ہوسکتا ہے نہ مدرسہ کی کارگزاری کا اظہار مقصود ہے اور یہ کارگزاری ہی کیا ہوسکتی ہے کہ ساری عمر میں مدرسہ سے ایک طالب علم کی تکمیل ہوئی، نہ اس سے کچھ چندہ کی کوشش مقصود ہے کیونکہ یہ دفتر ہی یہاں بند ہے، نہ یہاں اس کی سعی ہے، نہ مدرسہ سے چندہ کی فہرست اور حساب کی روداد شائع ہوتی ہے محض توکل پر کام چل رہا ہے نہ اس تقریب سے عوام پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ ان فارغ شدہ طالب علم کو آج ہی سے مقتدا اور عالم فاضل سمجھنے لگیں بلکہ محض یہ بتلانا ہے کہ ان صاحب نے ہمارے مدرسہ میں درسیات کی تکمیل کرلی ہے اور ہمارے نزدیک ان میں استعداد اور مناسبت علوم سے پیدا ہوگئی

(۱) ”آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کی مانع ہے“

ہے جس کی شہادت مدرسین مدرسہ نے سند دیکر ظاہر کی ہے باقی محض استعداد ومناسبت سے مقتدائیت اور فضل وکمال پیدانہیں ہوجاتا بلکہ اس کے لیے شغل درس تدریس اور کتب دینیہ کا مطالعہ کرتے رہنا ضروری ہے (اور یہی مطلب ہے مدرسین کا سند دینے سے کہ ہمارے نزدیک ان میں استعداد مقتدائیت موجود ہے اگر یہ اس استعداد سے کام لیتے رہیں گے تو ان شاء اللہ ایک دن مقتدا اور معتمد عالم ہوجائیں گے ۱۲) اور دوسری غرض اس تقریب سے وہ ہے جو آیت متلوہ پر اس مضمون کے انطباق سے ظاہر ہوگی۔

دستار بندی وصیت عملی ہے

اس آیت کے اخیر میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱) میں اس مضمون کو ذٰلکم وصکم بہ میں داخل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ جس طرح اس جملہ میں حق تعالیٰ نے صراط مستقیم کے اتباع کی وصیت فرمائی ہے اسی طرح دستار بندی اور اعطاء سند بھی وصیت عملی ہے جس سے مقصود فارغ شدہ طالب علم کو اتباع صراط مستقیم کی وصیت مقصود ہے اور ان کو بتلانا ہے کہ تم ہمارے نزدیک عامل شریعت ہو اور مقتدا بننے کی تم میں استعداد پیدا ہوگئی ہے اب ہم تمہاری اس قابلیت کو عملاً ظاہر کرتے ہیں کیونکہ عادۃً حیادار طبائع کو اس عملی صورت کی لاج بہت ہوا کرتی ہے جس سے وہ اپنے اوپر ایک بارگراں محسوس (۲) کرتے ہیں نیز عوام کو بھی اس صورت سے یہ وصیت مقصود ہے کہ یہ فارغ شدہ طالب علم اب عالم ہوگئے ہیں اب ان کا ادب کرنا چاہئے اور ان سے مستفیض ہونا چاہئے (بشرطیکہ یہ اسی شغل میں لگے رہیں) پس جس طرح کہ آیت میں اصل مقصود تاکیدی حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا جس کو مجازاً وصیت سے تعبیر کیا گیا اسی طرح یہاں اس عملی صورت (دستار بندی وغیرہ) سے اصل مقصود تاکیدی حکم ہے ان صاحب کو جن کی دستار بندی کی گئی ہے جس کو مجازاً میں وصیت سے تعبیر کرتا ہوں۔ اب اس مضمون کا تعلق آیت کے اس جزو سے واضح ہوگیا ہوگا۔

نیز انطباق کی ایک تقریر یہ ہوسکتی ہے کہ جن اعمال کی یہاں وصیت ہے ان پر عمل کرنا موقوف ہے علم پر تو عمل کی تاکید مستلزم ہے تحصیل علم کی تاکید کو تو تحصیل علم کو موجب اسعاد (۳) سمجھ کر اختیار کرے اور جہل کو موجب ابعاد سمجھ کر ترک کرے (۴)

(۱) ''اللہ تعالیٰ نے تم کو ان کا حکم دیا ہے تاکہ تم متقی ہوجاؤ'' (۲) اپنے اوپر ایک ذمہ داری کا بوجھ محسوس کرتے ہیں (۳) قرب الٰہی کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کرے (۴) بعد الٰہی کا ذریعہ سمجھ کر ترک کرے۔

اور تیسرے مضمون کے اعتبار سے میں اس بیان کے نام میں ایک اضافہ کر کے الاسعاد والابعاد مع مجلس قباد رکھتا ہوں گو نام لمبا ہوگیا مگر مولوی قباد کے دوست اتنی مشقت برداشت کرلیا کریں گے۔ لمبے نام پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص کی کنیت ابوعبداللہ تھی کسی نے اس سے پوچھا کہ تیری کنیت کیا ہے تو صرف ابوعبداللہ کہتے ہوئے اسے شرم آئی کہ یہ تو ذرا سا نام ہے تو وہ جواب میں کہتا ابو عبداللّٰہ السمیع العلیم الذی امسك السماء ان تقع علی الارض الا باذنه اس پر ظریف نے کہا مرحبا بك یا ابانصف القران واقعی خوب ہی ظرافت کا جواب دیا تو ایسے ہی اس وعظ کا نام بھی لمبا ہوگیا اتنا فرق ہے کہ وہاں طول بے ضرورت تھا اور یہاں بضرورت ہے۔

تینوں آیات کے آخر میں ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ کا عجیب نکتہ

اب یہاں آیات کے متعلق ایک نکتہ ہے اس کو بیان کر کے میں ختم کئے دیتا ہوں نکتہ یہ ہے کہ اس جگہ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَاحَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (آپ کہہ دیجئے آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے) سے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا۔(۱) تک تین آیتیں ہیں اور ہر آیت کے ختم پر حق تعالیٰ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ(۲) فرمایا ہے لیکن پہلی آیت کے اخیر میں تو ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے کہ تم سمجھو) فرمایا اور دوسری آیت کے ختم پر ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو) فرمایا اور اس تیسری آیت کے اخیر میں ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ فرمایا ہے اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جب وصیت سب کی مقصود ہے تو اس تفرق عنوان(۳) کی کیا ضرورت ہے گو اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ مقصود تفنن کلام ہے جو ایک شعبہ ہے بلاغت کا اور کسی نکتہ کے بیان کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی مگر بعض لوگ چلبلے ہوتے ہیں وہ اتنی بات پر کفایت نہیں کرتے بلکہ ان کا ذہن اس سے آگے چلتا ہے تو انہوں نے اس تفرق عنوان میں یہ نکتہ بتلایا ہے کہ پہلی آیت میں جن پانچ امور کا ذکر ہے ان میں سے بجز

(۱) ''یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے'' (۲) ''اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو'' (۳) عنوان بدلنے کی کیا ضرورت تھی۔

اساءۃ بالوالدین کے اہل عرب اعتقادی غلطی کرتے تھے کہ امور قبیحہ کو مستحسن سمجھتے تھے صرف اسائۃ بالوالدین (یعنی ماں باپ کے ساتھ برا سلوک کرنے) کو اعتقاداً اچھا نہ سمجھتے تھے اس کے سوا سب میں ان کی اعتقادی غلطی تھی اس لیے باعتبار اکثر کے وہاں تَعْقِلُوْنَ فرمایا کیونکہ اعتقادیات کا تعلق زیادہ تر عقل سے ہے اور دوسری آیت میں مخاطبین کی کوئی اعتقادی غلطی نہ تھی بلکہ وہ احکام عمل کے متعلق ہیں جن میں وہ تغافل وسہو کرتے تھے اس لیے وہاں تَذَکَّرُوْنَ مناسب ہوا۔ اور تیسری آیت میں کسی خاص حکم کا بیان نہیں بلکہ عام حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا تو وہاں تَتَّقُوْنَ مناسب ہوا کیونکہ تقویٰ بھی شعراً عام ہے جس کا تعلق عقائد واعمال وغیرہ سب سے یکساں ہے تو بعض عقلاء نے یہ نکتہ بیان کیا ہے اگر کسی کو پسند ہو تو اس کو اختیار کرے۔

گناہوں سے بچنے کی ہمت کی آسان ترتیب

ورنہ اس کی کوئی ضرورت ہے نہیں اور بظاہر یہ نکتہ بعید بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو لطائف تھے مگر اصل مقصود میرا وہی مراقبہ ہے کہ ہر کام اور ہر حرکت وسکون میں یہ سوچا جائے کہ یہ فعل آخرت کے لیے معین ہے یا مضر اگر معین ہو تو اس کو کیا جائے اگر مضر ہو تو نہ کیا جائے اس طرح ان شاء اللہ بہت جلد معاصی سے اجتناب کی ہمت پیدا ہو جائے گی اور جو اس سہل ترکیب سے بھی کام نہ لے تو وہ اپنے ہاتھوں محروم ہونا چاہتا ہے اس کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمادیں اور عمل کی توفیق دیں اور ان فارغ شدہ طالب علم کے لیے بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ ان کو صراط مستقیم پر چلائے اور ان کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائیں۔ آمین۔ (۱)

وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی الہ و اصحابہ اجمعین

(۱) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

خلیل احمد تھانوی ۲۲/۱۱/۱۴۴۰ھ

أخبار الجامعة

محمد منیب صدیقی

ادارۃ أشرف التحقیق۔ جامعہ دار العلوم الاسلامیۃ۔ لاہور

۱۔ حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی خصوصی دعوت پر جامعہ ہذا میں 21 ستمبر کو مصر سے مشائخ وعلماء کا ایک وفد تشریف لایا جس نے طلباء سے خصوصی خطاب بھی کیا اور عربی زبان کی اہمیت پر طلباء میں ایک مختصر سے مقابلے کا بھی انعقاد کیا۔ مصر سے آنے والے مہمانان گرامی میں دکتور محمد ناشی، دکتور عبد الرحمن حماد، دکتور محمد الراسخ، دکتور محمد النادی اور دکتور محمدی حضیری شامل تھے۔

حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم ماہ اکتوبر میں سعودیہ عرب کے دورہ پر گئے جہاں آپ نے مختلف پروگراموں میں شرکت کی جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۲۔ حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم ماہ اکتوبر میں سعودیہ عرب کے دورہ پر گئے جہاں آپ نے مختلف پروگراموں میں شرکت کی جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ مورخہ 14 اکتوبر کو مکہ مکرمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے زیر اہتمام عالمی کانفرنس میں شرکت کی جس کا عنوان تھا ''قرآن وسنت کی خدمات'' اس کانفرنس میں قرآن وسنت پر کی گئی خدمات کا تعارفی خاکہ پیش کیا گیا اور آئندہ مزید وسعت وترقی کے لئے ٹیکنالوجی کی مدد کا جائزہ لیا گیا۔

ب۔ اگلے روز 15 اکتوبر کو قاری صاحب نے عالمی مسابقہ حسن قراءت کے آخری مرحلہ کی تیاریوں کے مشاورتی اجلاس میں شرکت کی۔

ج۔ 16 اکتوبر کو مدینہ منورہ میں دارالفرقان کے زیر اہتمام دنیا بھر سے قرآن کریم کے اساتذہ کرام کو مدعو کیا گیا جن میں قاری صاحب دامت برکاتہم کو بھی 30 سال سے زائد قرآن کریم کی خدمت پر اعزازی شیلڈ سے نوازا گیا۔

د۔ مدینہ منورہ میں حضرت قاری صاحب نے اپنے استاذ، مسجد نبوی ﷺ کے قدیم امام شیخ علی عبدالرحمن الحذیفی دامت برکاتہم العالیہ کی عیادت کے لئے ان کے بیٹے احمد علی الحذیفی سے ملاقات کی، شیخ کی طبیعت کے احوال بھی دریافت کئے اور شیخ احمد علی کو مسجد نبوی میں امامت کی تقرری پر مبارک باد دی۔

۳۔ اگلے ماہ دسمبر میں حضرت مولانا مشرف علی تھانویؒ کے بڑے بیٹے جناب ڈاکٹر مولانا اشرف علی فاروقی صاحب کو اور بندہ ناچیز کو جنوبی کوریا کی ایک کمپنی ''کوریا حلال اتھارٹی'' نے اپنے ملک میں اسلامی بنکاری و حلال فوڈ پر تربیتی کورس کروانے اور اسلامی معیارات کے ترتیب دینے کے لئے مدعو کیا ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ملک میں سرکاری طور پر رائج معیارات کی ترتیب و تدوین پاکستان کے علماء کی زیر سرپرستی ہو، ہمارے لئے باعث صد افتخار ہے کہ جامعہ ہذا کی کارکردگی و عالمی شہرت کو دیکھ کر انہوں نے جامعہ سے دو افراد کا انتخاب کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے راقم (محمد منیب صدیقی) اور ڈاکٹر اشرف علی فاروقی صاحب 9 دسمبر کو لاہور سے جنوبی کوریا کے لئے روانہ ہونگے اور 23 دسمبر کو واپسی ہوگی ان شاء اللہ۔

۴۔ جامعہ میں فترہ اولی کے امتحانات کا آغاز ہو چکا ہے۔ تمام قارئین سے دعاؤں کی درخواست ہے کہ اللہ تعالی تمام طلباء کو دین و دنیا کی ترقیاں و کامیابیاں نصیب کرے۔ جامعہ کی مشکلات کے حل اور اسباب کی غیب سے فراہمی کے لئے دعا کی درخواست ہے۔